تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

"یعنی پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحابِ دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، اُن کے علمی کارناموں کی روداد اور اُن کے اثرات و نتائج کا تذکرہ۔"

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رح

مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ

تاریخ دعوت وعزیمت

حصہ اوّل

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ ——— جولائی ۲۰۰۶ء

نام کتاب ——— تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اول)

نام مصنف ——— مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

صفحات ——— ۴۳۶

تعداد ——— ایک ہزار

قیمت ——— RS.100/-

طابع ——— کاکوزی آفسیٹ پریس، لکھنؤ

ناشر ——— مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

Post Box No. 119
Nadwatul Ulama
Lucknow.
Tel : 0522-2740539
Fax : 0522-2740806
e-mail : info@airpindia.com

تاریخ دعوت وعزیمت

حصہ اوّل

عربی ——— کویت وبیروت ——— متعدد ایڈیشن

انگریزی ——— لکھنؤ ——— دوسرا ایڈیشن

اردو ——— لکھنؤ ——— ۶ واں ایڈیشن

اردو ——— کراچی ——— متعدد ایڈیشن

اسی طرح ترکی اور فرنچ زبانوں میں اشاعت ہوچکی ہے۔

فہرست

تاریخ دعوت وعزیمت

حصہ اول

دیباچہ طبع دوم

"تاریخ دعوت وعزیمت" حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر ناچیز مصنفِ کتاب اللہ تبارک وتعالےٰ کے حضور میں بہ ہزار زبان ثناخوان، اور سپاس گذار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آرہی ہے، لیکن اس کی وجہ کاتبوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں، اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گذر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انھوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کردی، اس کے لئے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور معذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین ومواد میں تعداد وعنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ وقیع اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت وافادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان "فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" کے تحت تاتاری حملہ اور اس کے اسباب کے مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی، معاشرتی،

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے، اور اس فتنۂ عالم آشوب، اور طوفان بلاخیز کے باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الٰہی قانون مجازاۃ کی مدد سے معلوم کرنے، اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی، اور مصنف کی بعض معذوریوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایمانی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے، جس کو بہت آگے بڑھایا جاسکتا ہے، بایں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و موعظت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں "دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی" کے زیر عنوان کیا گیا ہے، جس میں مسیحیت، اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس نئے ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں، اور جن کا تذکرہ "پیش لفظ" میں کیا گیا ہے، ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی

۳ صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء دوشنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کہ رفقا کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہونچایا جائے، ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس تربیتی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان "اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں" تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، احباب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے، اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر (ہمارے محدود علم کے مطابق) کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہیے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں، جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنھوں نے حالات سے کشمکش کی، اور جو فکری اور علمی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور علمی

حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے، اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور نُدرت نہیں پائی جاتی صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷۔۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہلِ دعوت و عزیمت کو پیدا کرتی رہی ہے، اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک احساسِ کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے، جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں، بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں، جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے، اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے، یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں، جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو، جنھوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے، اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدِّ باب کیا ہے، اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلۂ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انحطاط و ارتقا کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے، وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کمیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا، اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گذرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیشِ نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بحث کرنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ ۱۳ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلابِ حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے، اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے، اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جا سکتے، مگر دین کی تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:۔

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور خلا رہ گیا، تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے، جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے، لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدانِ عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے، ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۳) کسی صاحبِ دعوت، یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہوسکتا، اور قارئین اس کا لطفِ صحبت اور شرفِ ملازمت حاصل نہیں کرسکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحبِ دعوت مصلحین، مصنفین اور اصحابِ فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مؤلف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتد بہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ، اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا ہے اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرانے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزارے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مؤلف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کرسکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحبِ ترجمہ کی زبان و ادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابلِ اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح "چوب خشک" اور ناقلِ بے ضمیر ہونا چاہیئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ متقدمین اہلِ دعوت و اہلِ فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور علمی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوقِ خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوقِ عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحبِ نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کردیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے، تو اس کو بھی پیش کردیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجاتی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا مبسوط ہوگیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنانا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہلِ دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مؤلف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدتِ تصنیف، جیسا سکونِ خاطر،

جتنا وسیع و عمیق مطالعہ، اور جیسا وسیع اور متنوع علم درکار ہے، مصنف اس سے بہرہ مند نہیں، لیکن جو کچھ بھی اس عرصہ اور ان حالات میں ہوسکا، اور جو ناظرین کے سامنے ہے، وہ مصنف کی پریشان خاطری، انتشار ذہنی اور علمی بے بضاعتی کے پیش نظر محض تائید الٰہی اور توفیقِ خداوندی ہے، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔

ابوالحسن علی ندوی

۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۴ھ — دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ رائے بریلی

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالےٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جاچکا ہے کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۔ ۳)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی، اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کرچکا۔

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا شباب ہر وقت قائم ہے۔ ؏

جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سدا جواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالےٰ نے آخری طور پر جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پُر ہے، اور حرکت اس کی رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالےٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہوا اور اپنی زندگی کھوچکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے، جو علیم و حکیم صانع کی صنعت کا

بہترین نمونہ ہے۔

ذَالِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۝ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۝ (النمل ۸۸) کاریگری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

امتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امت آخری اور عالمگیر اُمت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ رہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان وزمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرمِ عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت وطاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے،

بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس "تریاق" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لا سکتا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہار نہ سکے، اور انھوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح، اور اس کے نظامِ عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھو دیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی وخارجی حملوں کو برداشت کر گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال ورسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد ولادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے، اور ان کے سامنے سپر ڈال دے، لیکن امتِ مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنھوں نے تحریفات وتاویلات کا پردہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور "دین خالص" کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُرزور حمایت کی، عقائدِ باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال ورسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین"[1] کی سخت مذمت کی، اور جابر سلاطین کے سامنے

[1] متکبر دولتمندوں اور مستغنی آسودہ حال اور فارغ البال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

کلمۂ حق بلند کیا، عقلیت پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کردی، یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے، اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "ید بیضا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کردیا، اور حق روشن ہوگیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالے کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے، اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امّت سے لینا ہے، اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا، اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کردیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے نرغہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقتِ ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُرزور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر میدان میں آجائے، اور اپنے یقین، سچّی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیرووں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کردے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی، جس کی نظیر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرکانہ مذہب میں تبدیل ہوگئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل، اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایک ایسی جست یا چھلانگ کے مرادف تھی، جس میں

پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیّر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیحؑ نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں دی تھی، اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیحؑ کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی، عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحف مقدسہ کی تمثیل و تجسیم کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہبِ ایسانی (ESSENIO) کا داعی ہے حضرت مسیحؑ کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم وابستہ کردیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور روایات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیحؑ کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں، حضرت مسیحؑ نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار دے رکھا ہے"[1]

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرے، اور اس نقطہ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیحؑ اور ان کے مخلص خلفاء اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیٰحدہ کرسکے، آخرکار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلط رُخ اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں، اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

[1] ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY – P. 128

فضلاء کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی، جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے:۔

"اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں جزوی کامیابی بھی کیوں نہ ہوئی تو بلا کسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطی کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی"[1]

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چرچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز بروئے کار لانے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی حقیقت ہے"[2]

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے:۔

"سولھویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں، متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں، لیکن بلا استثناء ان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا"[3]

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لوتھر نے (اپنے مخصوص دائرۂ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی، جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے سر تھوپ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم پڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا

---

[1] ENC. BRITTANICA-ED. IX VOL. XX P. 320
ARTICLE BY J.B. MULLINGER.

[2] ایضاً ص ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۳۲۱

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل کا حل، اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے اپنی سادگی اور خالقِ کائنات سے براہِ راست روحانی نسبت بالکل کھو دی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توحید خالص اور معاملات میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سر رشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں، جن پر کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے، جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنیشد کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں تو ضرور پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو عملی نظام اور عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا، اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے چینی تھی، جس نے آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک دنیا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہوگئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب[1] بہت سرعت کے ساتھ پھیلا، اور ایشیا کے جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو بحر ہند اور بحر الکاہل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہوگیا۔

لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستہ سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہوگئی، مورتیاں اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں پیچیدگی او بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہوگئے، پروفیسر ایشور اٹوپا اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں :۔

- "بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھر مار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آرہی تھیں"۔[2]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولتمند ہوگئے، اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہوگئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہوگیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYS DAVIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں آکر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہوگئی، ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا میں

---

[1] بودھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردد اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبدأ و معاد کے سلسلہ میں کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہی رائے ہے، دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

[2] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشور اٹوپا۔

ذہن کی ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، اور بانیٔ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے"۔[1]

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراوٹ پیدا ہوگئی، اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہوگئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس طویل مدت میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے، اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دورِ شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے"۔[2]

غرض قدیم ہندو مذہب، بودھ مت کے سامنے بالکل پنپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شنکر آچاریہ[3] نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رُو بزوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شنکر آچاریہ نے اپنی ذہانت، مذہبی جرأت اور جوشِ عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالق کائنات سے براہِ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہیئت پر قائم ہیں، اور دورِ انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلوپیڈیا (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS.) کے مقالہ نگار (V.S. GHATE) جو الفنسٹن کالج بمبئی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شنکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا جس کی "اوپنشد" میں تعلیم دی گئی ہے"

---

[1] تلاش ہند ص ۲۰۱، ۲۰۳ [2] ایضاً ص ۲۰۱، ۲۰۳ [3] شنکر آچاریہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں گزرا ہے، ۳۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنشید" اور بھگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے، شنکر آچاریہ نے بت پرستی کی نہ مخالفت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شنکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، "اپنے نشو و نما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہیے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے"، شنکر نے بتوں کی اجازت دی بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہونچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوں[1]"۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شنکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر احیا تھا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تغیر پذیر عہد سب کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپر ڈال دی ہے، اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

---

[1] ماخوذ از مقالہ شنکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو۔
ENC. OF RELIGION AND ETHICS—FOVRTH EDITION. 1958
ARTICLE SANKARACHARYA.

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں، جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوتِ عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پُرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنھوں نے اس کی جوانی کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیر ہے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی رہے گی، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہر نئے فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُرآشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی، حقیقتِ اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلامیہ کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریف اور اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں، جو قدریت، جہمیت، اعتزال، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الٰہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد ومذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقتِ اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید وانقلاب کی کوشش اور دعوت واصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی مسلسل ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات وکیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ وشیوخ کے نصائح وملفوظات اور حقائق ومعارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پُراثر اور بابرکت مجلسوں کی روئداد پیش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواعظ کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات وافکار اور جذبات وکیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں ہیں جو احتساب سوسائٹی پر تنقید اور بدعات ومنکرات کے رد وابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہوسکتا اور کوئی وسیع النظر نکتہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کرسکتا تو ایک مربوط ومکمل تاریخ اصلاح وتجدید پیش کرنے میں کامیاب ہوجاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت وعزیمت دونوں چیزیں اس اُمت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انھوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہونچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہلِ مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ ومضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنّت سنیہؐ، اخلاق عالیہ، فقہ وشریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں بھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے تھے، ان کو اُجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو ازسرِ نو استوار کیا، نو وارد فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس... امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث وفقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریع کا خزانۂ عامرہ اور زندگی ومعاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح وحقیقی اسلام کی برملا وآشکارا دعوت دی، جس نے شکوک وشبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کرکے داعیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت وتذکیر اور انذار وتبشیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ جوالہ کی حرارت وحرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تُند وتیز دھارے کے سامنے کھڑے ہوکر اس کی تیزی وبلا خیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے

سے محفوظ رکھا جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے درپے خارجی حملوں کو سہار لینے کی قوت عطا کی، جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکار کیا، جو زورِ شمشیر اور نوک خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالم اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کرکے رکھ دیا تھا، جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرۂ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و بلیغ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیرِ دام کیا، جو علمی مباحث اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے، اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصّہ اور مرتبہ ہے، تاریخ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے، ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دوربین سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجموعہ نہ پہونچ پاتا جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور موعظت کا وافر سامان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوام عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے آئندہ صفحات میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنھوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ وبیداللہ التوفیق

پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

عمر بن عبد العزیزؒ

عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافتِ راشدہ کے اختتام، اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کردی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافتِ راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں اُبھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتاب و سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور "مصالح ملکی" بن گیا، تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کردیا تھا، اور جو بادیۂ عرب میں پناہ گزیں تھی، پھر واپس آگئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزّہ پروری جو خلافتِ راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہنر اور محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے،[1]

---

[1] اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبۂ مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہوگیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے، جو ابو الفرج اصفہانی نے اغانی میں نقل کیا ہے کہ عہد اموی کے دو عرب سرداروں حوشب اور عکرمہ کے درمیان عرصے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے، اور مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں حوشب کا پلہ اکثر بھاری رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حریف کو زک دینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صدہا بوریاں آٹے کی خریدیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کردیں کہ آٹا گوندھ لیا جائے اس گندھے ہوئے آٹے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھروا دیا، اور اوپر سے گھانس ڈال دی، اور اس کا انتظام کیا کہ حوشب کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندھے ہوئے آٹے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہوگیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندھتا ہے کہ گھوڑا اس میں گر گیا، لوگ تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی، اور سارا جسم (باقی صــ۳۲ پر)

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسہ پیسہ سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعرا، خوشامدی درباریوں اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جس پر مسلمانوں کی دولت بیدریغ صرف ہوتی تھی، اور ان کی بے عنوانیوں سے چشم پوشی کی جاتی تھی[1]، گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہونچ گیا تھا[2] حکومت کی غلط روی، اور اہلِ حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی، اور "مترفین" کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے، اور چالیس[4] برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک دین کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا، جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی للّٰہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی، اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظامات کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے با اثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلی آبائہ السّلام) کی تھی، جو عبادت و تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں

(باقی صفحہ ۳۱ کا) ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی، اور شعرا نے اشعار کہے، اس طرح عکرمہ نے اپنے حریف کے مقابلہ میں فتح حاصل کر لی، اور اپنا تفوق تسلیم کروا لیا (از رنات الثالث جلد ا صفحہ ۱۳۹-۱۴۰)

[1] اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر اخطل (م ۹۵ھ) خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا کہ گلے میں سونے کی صلیب ہوتی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے، اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (اغانی ج ۷، ص ۱۷۸)

[2] اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مغنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی، اور خود حنین دب کر مر گیا۔

(اغانی ج ۲ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجرِ اسود تک نہیں پہونچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام[1] کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے بآسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا[2]۔

اسی طرح دوسرے فضلاء اہلِ بیت حضرت حسن المثنیٰ، اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبد اللہ المحض نیز دوسرے فضلائے تابعین حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہؓ بن الزبیر[3] مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

[1] حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا ۱۲۔ [2] یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هٰذا الذي تعرف البطحاء وطأته　　　والبيت يعرفه والحل والحرم

محققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

[3] مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق واوصاف کی محافظ اور قرنِ اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرۂ اثر وسیع اور مستحکم ہوگیا، اب اخلاقی ودینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں ایک سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ وسرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا دلیرانہ و منظم مقابلہ ناکام ہوچکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات وآثار نہ تھے، شخصی وموروثی حکومت نے اصلاح وتبدیلی کے دروازے بند کردیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی، اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبدالعزیزؓ کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمرؓ بن عبدالعزیز کی ذات ہے، جو خود بانیٔ خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں (ام عاصم) فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سنجوگ[1] اسی لئے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں ایک خلیفۂ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کردے۔

عمر بن عبدالعزیزؓ ۶۱ھ میں پیدا ہوئے، وہ خلیفۂ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچازاد بھائی تھے اور اس کے پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی خلافت

[1] اس رشتہ کی تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے منادی کروائی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے، بیٹی صبح ہورہی ہے، دودھ میں پانی ملادے! لڑکی نے جواب دیا کہ اماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے اس کی ممانعت کی ہے؟ عورت نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ امیر المومنین کو خبر نہیں تو خدا تو دیکھ رہا ہے! حضرت عمرؓ نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا جوانمرد پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کرلیا، عمر بن عبدالعزیز اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۸،۱۷)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحبِ ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس راستہ سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن تھی، سوائے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصبِ خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت کی ایک نشانی تھی، موروثی نظامِ حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لانبی لانبی قبائیں پہنائیں، اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں میں نہ جنچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں، رجاء بن حیوۃ" نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجاء کا یہ کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیزؓ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلا تاخیر ان چند عمالِ حکومت کو معزول کیا، جو سخت ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک واحتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال میں داخل کیا، اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت یکسر بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جواری اور باندیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کردیا، مظالم کا تصفیہ کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسریٰ وقیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کرلی تھی، سنت اور خلافتِ راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور مطابق سنت بنادیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کردی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقراء میں بھی ملنی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی کی کہ بعض اوقات کُرتا سوکھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا، بنی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا نپا تُلا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے، تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منھ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں[1]، اس وقت جبکہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آ گیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی، اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گُل کر دیتے، اور اپنی ذاتی شمع منگواتے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے مُشک کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا۔[2]

ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمّال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور جزرس ہوں گے، والئ مدینہ ابوبکر بن حزم نے سلیمان بن عبدالملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قندیلیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابوبکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جاڑے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ (محمد بن عبدالحکم ص۵۵) [2] سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ص۴۴

اور قندیلیں کافی ہیں انہی سے تم کو کام لینا چاہئے[1]، اسی طرح کی ایک درخواست پر جس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ:-

"قلم باریک کرو اور گھٹا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواہ مخواہ بیت المال پر بار پڑے۔"[2]

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انھوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا، اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بحث نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انھوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:-

"محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔"[3]

حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدتِ خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انھوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمّی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، اہلکاران سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انھوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی خوشی ہو گی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۶۴ [2] ایضاً ص۶۴ [3] کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ ص۷۵

آمدنی بند ہوجانے کی وجہ سے) ہم تم دونوں کھیتی کرکے اور ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں[1]، یمن میں خراج کی ایک متعین مقدار مقرر تھی خواہ فصل اچھی ہو یا بُری، حاکم نے اطلاع دی، آپ نے فرمایا کہ فصل کے مطابق رقم وصول ہونی چاہیے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ سارے یمن سے ایک مٹھی غلہ وصول ہو، میں اس پر راضی ہوں[2]، چنگی ساری مملکت سے معاف کردی، اور عمّال کو لکھا کہ وہ نجس ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا	اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم مت دو، اور زمین میں
فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ (ہود - ۸۵)	فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

لوگوں نے اس کا نام بدل کر اس کو جائز بنا لیا ہے[3]، چند شرعی محاصل کے علاوہ ہر طرح کے ناجائز محاصل اور بیسیوں ٹیکس جو سابق فرمانرواؤں اور عمّالِ حکومت نے ایجاد کئے تھے، یکسر معاف کردیئے[4]، خشکی اور سمندر کے راستوں کو کھولنے کی ہدایت کی، اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں[5]۔

مملکت میں ایسی اصلاحات کیں، جن کے نتائج بہت دور رس تھے، ساری مملکت کے لئے یکساں پیمانے مقرر کئے، جس میں فرق نہیں ہوسکتا تھا[6]، حکام وعمال سلطنت کو تجارت کی ممانعت کی[7]، بیگار کو قانوناً ممنوع قرار دیا[8]، سلطنت کی زمین کا خاصا رقبہ امرا اور شاہی خاندان کے افراد و حکام نے اپنی شکارگاہ یا چراگاہ کے لئے گھیر کر بیکار رکھا تھا، حکم دیا کہ وہ عوام کی ملکیت ہے[9]، عمال کو تحفہ تحائف قبول کرنے کی ممانعت کی اور فرمایا کہ اگر وہ کبھی تحفہ تھا، تو اب رشوت کے سوا کچھ نہیں ہے[10]، حکام کو ہدایت کی کہ لوگوں کو اپنے تک پہنچنے اور شکایات پہونچانے کے پورے مواقع اور سہولتیں مہیا کریں، حج کے موقع پر اعلان ہوتا تھا، کہ جو کسی ظلم کی اطلاع یا کوئی نیک مشورہ دے گا، اس کو سَو سے لے کر تین سَو دینار تک انعام ملے گا[11]۔

اعمال واخلاق کی طرف توجّہ

اس وقت تک خلیفہ صرف حاکم وبادشاہ ہوتا تھا، اس کو لوگوں کے اعمال واخلاق کی طرف توجہ کرنے کی

[1] مناقب عمر بن عبدالعزیزؒ ص۶۴ (طبع یورپ) [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص۱۲۶ [3-4] ایضاً ص۱۰۳ [5] ایضاً ص۹۹ [6] ایضاً ص۹۸ [7] ایضاً ص۹۹ [8] ایضاً ص۱۰۰ [9] ایضاً ص۹۷ [10] ایضاً ص۱۶۲ [11] ایضاً ص۱۴۱

نہ فرصت تھی، نہ اہلیت، نہ اس کا یہ منصب سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو دینی مشورے دے، ان کے اخلاق ورجحانات کی نگرانی کرے، اور وعظ ونصیحت کا منصب اختیار کرے، یہ کام علما ومحدثین کا سمجھا جاتا تھا، عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دوئی کو مٹایا اور اپنے کو حقیقی معنی میں "خلیفہ" ثابت کیا، انھوں نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی عمّالِ حکومت اور امرا اجناد (فوجی افسروں) کو طویل طویل خط اور فرمان لکھے جو انتظامی سے زیادہ دینی واخلاقی ہیں، اور ان میں حکومت کی روح سے زیادہ مشورہ ونصیحت کی روح ہے، ایک خط میں انھوں نے سابق اسلامی زندگی (عہدِ نبوت وخلافت) اور اس وقت کی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے، اور اسلامی نظامِ مالیات اور طرزِ حکومت کی تشریح کی ہے[1]، ان خطوط میں وہ امرا اجناد (فوجی افسروں) کو وقت پر نمازیں پڑھنے، اور ان کے اہتمام اور علم کی نشر واشاعت کی تاکید کرتے ہیں[2]، عمال کو تقویٰ واتباعِ شریعت کی وصیت فرماتے ہیں[3]، اپنے اپنے علاقہ اور حلقہ میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کی ترغیب دیتے ہیں، اور اسی کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا مقصد بتلاتے ہیں[4]، ان کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اہتمام کی تاکید کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ اس فریضہ کے ترک ہوجانے کے کیا نقصانات ہیں، اور اس کا کیا وبال پڑتا ہے[5]، عمال سلطنت کو سزا وعقوبت میں اعتدال واحتیاط سے کام لینے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اسلام کے قانونِ تعزیرات کی تشریح کرتے ہیں[6]، پھر سلطنت کی عمومی شہری خرابیوں اور بداخلاقیوں کی طرف توجہ کرتے ہیں، نوحہ گری اور جنازہ میں عورتوں کے ساتھ جانے کو بند کرتے ہیں، پردہ کی تاکید کرتے ہیں[7]، قبائلی عصبیت کی مذمت اور اس کی ممانعت کرتے ہیں[8]، نبیذ کے استعمال میں بڑی بے احتیاطی شروع ہوگئی تھی، اور لوگ اس کے ذریعہ نشہ اور شراب تک پہنچ گئے تھے، جس سے مختلف قسم کی بداخلاقیاں پیدا ہو رہی تھیں، اس کی تحدید وتشریح کرتے ہیں[9]۔

تدوینِ علوم اور احیائے سنن

اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم کی تدوین اور سنتوں کی احیا کی طرف بھی توجہ کی، ابوبکر بن حزم جو ایک

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالحکم) ص۶۹ [2] ایضاً ص۷۹ [3] ایضاً ص۹۲ [4] ایضاً ص۱۳۷ [5] ایضاً ص۱۲۷ [6] ایضاً ص۱۰۰ [7] ایضاً ص۱۰۱ [8-9] ایضاً ص۱۰۳

بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:۔

انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔

آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔

انھوں نے تعین کے ساتھ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرۂ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابوبکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور مشاہیر علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:۔

انظروا الی حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ[1]۔

رسول اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف[2] مقرر کئے کہ وہ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔

وہ خود بڑے عالم تھے انھوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں، جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی، اور جو عمل نہیں کرے گا، اس کا ایمان نا مکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی، تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمہیں ان پر چلاؤں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا حریص بھی نہیں ہوں[3]"۔

چند خطوط و فرامین

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے قالب میں جو خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کارفرما تھی، (اور جو بالآخر ان کے

[1] تاریخ اصبہان (ابونعیم) [2] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۶۷ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس

نظامِ سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں، اور شاہانِ بنی اُمیّہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدِ اموی کے "نو دولت" جاہلیت کی رسم حلف و محالفت کو زندہ کر رہے ہیں[1] اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر "یا للبنی فلان، یا للمضر" (فلاں قبیلہ کی دہائی ہے، ہاں اے اہلِ مضر اپنے حلیف کی مدد کرو) کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ اخوت اور نظامِ اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا، اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ، سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ملکی مصالح سے شہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بارے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار ضحاک ابن عبدالرحمٰن کو لکھتے ہیں:۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا:۔

قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِينٌ ۝ يَّهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(المائدہ ۔ ۱۵،۱۶)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

[1] جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف بن جاتا تھا، پھر وہ ہر حال میں اس کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ (اسرآء ۱۰۵)

اور ہم نے اس قرآن کو راستی ہی کے ساتھ نازل کیا اور وہ راستی ہی کے ساتھ نازل ہوگیا، اور ہم نے آپ کو صرف خوشی سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم اے اہلِ عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فتنے تمہارے درمیان عام تھے، لوگ تم کو دبائے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا اس سے بھی تم محروم تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا تھا، وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ وجدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچالیا، تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، کہ لوگ انھیں اُچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (الصف - ۹)

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے، گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، ارشاد فرماتا ہے کہ:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔـا ۭ (نور ۵۵)

تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا، اور ان کے خوف کے بعد اس کو مبدّل بامن کرے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کردیا، اے اہلِ اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ ہوگے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے اور نہ کوئی حجت نہ کوئی بچاؤ ہے، اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (سورۃ القصص ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجہ میں جو واقعات پیش آئے ہیں، امت میں جو خونریزی، جو خانہ ویرانی، جو پراگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رک جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وعید سے

زیادہ کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے۔..........

جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ بیچارے اجڈ اور جاہل قسم کے لوگ ہیں، احکام الٰہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالےٰ کا اُن کے ساتھ جو معاملہ رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالےٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے، جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور یمن والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حمائتی اور ولی ہیں، سبحان اللہ وبحمدہ! یہ کس قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت، ذلت وخواری کا کیسا شوق ہے؟ یہ دیکھتے نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا، کس امن وامان سے اپنے کو محروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے، کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالےٰ کا یہ کلام نہیں سُنا:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ (الحجرات ۱۰)	مسلمان تو سب بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۝ (المائدہ ۳)	آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانۂ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلے اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے، اور ارشاد ہے "لاحلف فی الاسلام" (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور جتھہ بندی نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتۂ مخالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو..........

میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سُنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے، بڑے شدومد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ بنا رہا ہوں جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں، اور جو ہر شخص کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے"[1]

انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطۂ نظر اور طریق فکر دنیا دار بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:۔

" اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمرؒ کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المؤمنین نے ان کو اہل حرب سے اور ان اہلِ صلح سے جو مقابلہ میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المؤمنین نے ان کو حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز (ابن عبد الحکم) صـ ۱۰۴، ۱۰۷ ترجمہ مولوی ابو العرفان صاحب ندوی۔

کرتے ہیں، اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں، کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ان سے دراصل ہم کو مقابلہ کی قوت نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے، اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر، پس اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، یاد رکھو اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پا سکیں گے تو اپنی قوت کی وجہ سے بھی ان پر غالب نہ آسکیں گے، اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے تم پر کچھ محافظ مقرر کئے گئے ہیں، جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں، پس ان سے شرم کرو، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہونچاؤ، خصوصاً ایسی حالت میں کہ تمہارا دعوٰی ہے کہ تم راہِ خدا میں نکلے ہوئے ہو، اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے گئے گزرے ہیں، اس لئے گو ہم گناہ گار ہیں، لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے، کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں، جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، پس اللہ تعالےٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالےٰ سے تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو، میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالےٰ سے سوال کرتا ہوں۔

اور امیر المومنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں، اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں، جو مشقت میں مبتلا کر دے، اور سفر میں کسی ایسی منزل پر پڑاؤ سے گریز نہ کریں، جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا ہو کہ سفر کے تکان نے ان کی قوتوں کو گھٹا نہ دیا ہو، وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں، جو اپنے گھروں میں ہیں، ان کا سامان اور سواریاں ستائی ہوئی ہیں، پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سواریوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کریں گے، تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی، کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں، جہاں ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں، اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں، اور آرام کریں جس میں خود کو اور جانوروں کو آرام پہونچائیں، اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں، اور امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں، امن و امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے، نہ ان کے بازاروں میں، نہ ان کی مجلسوں میں، ہاں وہ شخص جا سکتا ہے، جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو، اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں، اور نہ ان کو کچھ اذیت پہونچائیں، سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو، کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے، جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے، جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلّف ہیں، پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم رہیں، تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو، اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ والے ملکوں پر غلبہ مت حاصل کرو، قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ[1] پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے، اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے، اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے، تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے، اور شرک والے ملکوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹائی ہے، اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوبست کر سکتا تھا، اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا، ہم نے تمہارے لئے قوت کی بہم رسانی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے، "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" اور امیر المومنین کی ہدایت ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور اہلِ ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پر ان کو اطمینان ہو، کیوں کہ دروغ گو کی اطلاع نفع نہیں پہونچاتی، اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو، فریب دہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے، تمہارا جاسوس نہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ[2]۔

[1] جزیہ وخراج وغیرہ [2] سیرت عمر بن عبد العزیز صہ۸۴-۸۷ ترجمہ مولوی ابو العرفان صاحب ندوی۔

ایک عمومی خط میں عمّالِ سلطنت کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"امّا بعد بےشک یہ ذمہ داری جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد فرمائی ہے اگر میں نے اس کو قبول کیا ہے کہ اس سے میرا مقصد کھانا، لباس، سواری یا شادیاں یا جمع اموال ہوتا، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے پہلے ہی یہ چیزیں اتنی دے رکھی تھیں جو مشکل سے لوگوں کو ملا کرتی ہیں، لیکن میں نے اس ذمہ داری کو بہت ڈرتے ڈرتے قبول کیا ہے، مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ عظیم الشان ذمہ داری ہے، اس کی باز پرس بڑی سخت ہے جس وقت فریق اور مدعی قیامت کے دن جمع ہوں گے تو اس کے معاملہ میں بڑی سخت جرح ہوگی ہاں اگر اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور نظر انداز فرمائے، اور رحم فرمائے تو الگ بات ہے۔

میں نے تم کو حکومت کا جو کام سپرد کیا ہے، اور جو اختیارات تفویض کئے ہیں، ان میں سے تم کو احتیاط اور خدا کے خوف کی ہدایت کرتا ہوں، ذمہ داریوں کی ادائیگی، اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کے اتباع اور اس کے نواہی سے اجتناب کی تاکید کرتا ہوں، جو باتیں اس کے خلاف ہوں، ان کی طرف بالکل توجہ کی ضرورت نہیں، تمہاری نظر اپنے اوپر اور اپنے عمل پر رہے، اور ان چیزوں کی طرف ہو جو تمہارے رب تک پہونچائیں اور جو تم اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان کرتے ہو، وہ تمہارے پیش نظر رہے، اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفظ و نجات اسی میں منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں منزل مقصود تک پہونچ جاؤ، اس یوم موعود کے لئے وہی چیز تیار رکھو، جو خدا کے ہاں کام آنے والی ہو اور دوسروں کے واقعات میں تم نے ایسی عبرتیں دیکھی ہیں، جن کے برابر ہمارا وعظ و نصیحت مؤثر نہیں ہوسکتی۔ والسلام۔"[1]

تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ

حضرت عمر بن عبد العزیز نے صرف مسلمانوں کی اصلاح اور ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ پر

[1] سیرت عمر بن عبد العزیز صہ ۹۲-۹۳ ترجمہ مولوی ابو العرفان صاحب ندوی۔

اکتفا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی طرف بھی خصوصی توجہ کی اور اس میں ان کو اپنے صدق و اخلاص کی برکت اور اپنی زندگی و عمل سے اسلام کی صحیح اور مؤثر نمائندگی کی وجہ سے بہت کامیابی حاصل ہوئی ـــــــ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے:۔

"عمر بن عبد العزیز نے ہندوستان کے راجاؤں کو سات خطوط لکھے اور ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کو اپنی سلطنتوں پر باقی رکھا جائے گا، اور ان کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

ان کے اخلاق و کردار کی خبریں وہاں پہلے ہی پہونچ چکی تھیں اس لئے انھوں نے اسلام قبول کیا اور اپنے نام عربوں ہی کے نام پر رکھے۔"[1]

جب اسماعیل بن عبد اللہ بن ابی المہاجر مولیٰ بنی مخزوم بلادِ مغرب کے والی بنائے گئے تو انھوں نے وہاں اپنے کردار و اخلاق کا بہت اچھا مظاہرہ کیا اور اہل بربر کو اسلام کی دعوت دی، حضرت عمر بن عبد العزیز نے ان لوگوں کو ایک خط بھیجا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، یہ خط اسماعیل نے مجمعوں میں پڑھ کر سنایا، اور اسلام بالآخر وہاں غالب آیا۔[2] اپنی خلافت کے بعد انھوں نے ماوراء النہر کے سلاطین کو اسلام کی دعوت کے خطوط لکھے اور خراسان کے جو لوگ اسلام لائے ان سے خراج معاف کر دیا، لیکن جو لوگ اسلام لائے اور ساتھ ہی انھوں نے سرائیں تعمیر کیں، ان کے لئے انعام اور وظیفہ مقرر کیا۔"[3]

ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا ردِّ عمل

عمر بن عبد العزیز کی مالی اصلاحات اور بندشوں اور نظامِ حکومت میں شرعی و اخلاقی پابندیوں سے بجائے اس کے کہ حکومت کو مالی خسارہ اور شہریوں کو نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا، ملک میں خوشحالی عام ہوگئی،

[1] فتوح البلدان۔ صہ ۴۴۶-۴۴۷ [2] ایضاً صہ ۳۳۹ [3] ایضاً صہ ۴۳۲

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیزؒ نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔[1]

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مختصر مدتِ خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمرؒ کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔[2]

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب ولید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے، تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ ولید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، سلیمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوعِ سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں نوافل و طاعات، ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے، تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنا قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کرو گے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔[3]

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جد و جہد کی روح اور قوتِ محرکہ

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۶۹ [2] ایضاً ص ۱۳۸ [3] تاریخ طبری واقعات ۹۶ھ۔

ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمراں کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرزِ عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

اِنِّیٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (الانعام ۱۵)

اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انھوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ "اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہونچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشتاق و متمنی ہے"۔[1]

ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انھوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگیٹھی رکھی تھی، وہ بجھ گئی۔[2] یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصریؒ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔[3]

عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنے کسی پیش رو کی مدت خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی اُمیہ جن کو اپنے

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۶۱ [2] ایضاً ص ۱۰۸-۹ [3] صفۃ الصفوۃ ابن جوزی، ج ۳ ص ۱۵۶

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی، اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پچھتاتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیۂ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے سنہ ۱۰۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے[1]، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔

[1] ابن سعد، ابن اثیر، ابن جوزی۔

دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے پنجے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس "ناپسندیدہ وقفہ" کی تلافی کی پوری کوشش کی، اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ، اس کی قوت کا راز اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق باللہ میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہوتا چلا آ رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود، اور اس کے نمائندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک و داعی تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیات پیدا کی تھیں، اور جو ایک نبی ہی پیدا کرسکتا ہے، وہ رو بہ تنزل تھیں، یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی، اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی، تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور، آخرت فراموش، مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو ہضم نہ کرلے، اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہوجائیں، آپ نے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں صاف صاف کہا تھا:۔

ما الفقر اخشى عليكم ولكن اخشى	مجھے تمہارے بارے میں فقر و افلاس کا خطرہ نہیں،
عليكم ان تبسط الدنيا عليكم كما	مجھے جو کچھ خطرہ ہے، وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر ایسی
بسطت على من كان قبلكم	کشائش و فراخی ہو جیسی تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی
فتنافسوها كما تنافسوها فتهلككم	تھی، اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع
كما اهلكتهم۔	کر دو اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کردے جیسے
	اگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص اور سر فروش بندے میدان میں آئے، جنھوں نے اپنی قوتِ ایمانی، سوزِ دروں، صحبت و تربیت، وعظ و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کردیا، انھوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا جس میں محض ایک بے سیرت بے روح، اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلاء تابعین کی ایک سربرآوردہ جماعت تھی، جن میں سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ اور شعبیؒ خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصریؒ

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصریؒ ہیں، جو ۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زیدؓ بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے، اور خود انھوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصریؒ کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصریؒ میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرامؓ کا انھوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے، اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے یا صحابۂ کرامؓ کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا سا زبان آور اور قادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابوعمرو بن العلا کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔[1] وسعتِ علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی،[2] ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا:۔

کان من دراری النجوم علما وتقوی	وہ اپنے علم و تقوی، زہد و ورع و استغناء و عالی ہمتی
وزهدا وورعا وعفة ورقة، وفقها	لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک درخشاں
ومعرفة يجمع مجلسه ضروبا من الناس	ستارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
هذا يأخذ عنه الحديث، وهذا يلقن	تھے، اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث
منه التاويل وهذا يسمع منه الحلال	حاصل کر رہا ہے، ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے، ایک
والحرام، وهذا يحكى له الفتيا وهذا	فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتوی پوچھ رہا ہے
يتعلم الحكم والقضاء، وهذا يسمع الوعظ	کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
وهو في جميع ذلك كالبحر العجاج تدفقا	ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے، اور وہ ایک بحر زخار ہیں جو
وكالسراج الوهاج تالقا ولا تنس مواقفه	موجیں لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو
ومشاهده في الامر بالمعروف والنهي	پرنور کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے
عن المنكر عند الامراء واشباه الامراء	سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امراء کے روبرو
بالكلام الفصل واللفظ الجزل۔[1]	پوری فصاحت اور پرشکوہ الفاظ میں اظہار حق کے
	واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

[1] دائرۃ المعارف لبستانی ج ۷، ص ۴۴ [2] ایضاً۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ قال اور صاحبِ کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوفہ میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقۂ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو "کلام نبوت" سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں لکھا ہے کہ "اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے، ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابۂ کرامؓ کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا"[2]

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو امت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہیے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں مکہ معظمہ ہمیشہ سے عالمِ اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔[3]

حسن بصریؒ کے مواعظ

حسن بصریؒ کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

[1] ابوحیان التوحیدی نے اس کو ثابت بن قرہ سے نقل کیا ہے، [2] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۱۶۸ [3] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷، ص ۴۴

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کی تعلیم، طولِ امل اور فریبِ نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے تھے، انہی مضامین کی ضرورت تھی، انھوں نے چونکہ صحابۂ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا شباب دیکھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کی ایمانی کیفیات اور ان کی اخلاقی و علمی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہلِ زمانہ پر تبصرہ، صحابۂ کرامؓ کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

هيهات هيهات اهلك الناس الاماني	ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وايمانٍ	غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا يقين، مالي ارى رجالاً ولا ارى	مگر (اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے) صبر نہیں، ایمان ہے
عقولاً واسمع حسيساً ولا ارى انيساً	مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ نایاب؛
دخل القوم والله ثم خرجوا، وعرفوا	آنے جانیوالوں کا شور ہے مگر ایک بندۂ خدا ایسا نظر
ثم انكروا وحرموا ثم استحلوا، انما دين	نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر
احدكم لعقة على لسانه اذا سُئل أمؤمن	نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مکر گئے، انھوں نے
انت بيوم الحساب؟ قال نعم اكذب	پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیا ہے؟
ومالك يوم الدين، ان من اخلاق	زبان کا ایک چٹخارہ! اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب

المؤمنين قوة في دين وايماناً في يقين	پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ ہاں! قسم
وعلماً في حلم وحلماً بعلم وكيساً في	ہے روزِ جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو
رفق وتجملاً في فاقة وقصداً في غنى	یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین
وشفقة في نفقة ورحمة لمجهود، وعطاءً	ہو، اس کے علم کے لئے حلم اور اس کے حلم کے لئے علم باعث
في الحقوق، وانصافاً في استقامة لايحيف	زینت ہو، عقلمند ہو لیکن نرم خو، اس کی خوش پوشی
على من يبغض ولا ياثم في مساعدة من	اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے،
يحب ولا يهمز ولا يغمز ولا يلمز ولا يلغو	دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے
ولا يلهو ولا يلعب، ولا يمشي بالنميمة	پائے، خرچ کرنے میں شفیق، خستہ حالوں کے حق میں
ولا يتبع ما ليس له ولا يجحد الحق الذي	رحیم و کریم، حقوق کی ادائی میں کشادہ دست و فراخ دل،
عليه، ولا يتجاوز في العذر ولا يشمت	انصاف میں سرگرم و ثابت قدم، کسی سے نفرت ہو تو اس کے
بالفجيعة ان حلت بغيره ولا يسرّ	حق میں زیادتی نہ ہونے پائے، کسی سے محبت ہو تو اس کی
بالمعصية اذا نزلت بسواه، المؤمن	مدد میں حدِ شریعت سے نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چینی کرتا ہو،
في الصلوٰة خاشع والى الركوع سارعٌ	نہ طنز و اشارہ، نہ طعن و تشنیع، نہ لایعنی سے اس کو کچھ کام
قوله شفاء وصبره تقي، وسكوته فكرة	ہو، نہ لہو و لعب سے دلچسپی، چغلخوری نہیں کرتا، جو اس کا حق
ونظرته عبرة، يخالط العلماء ليعلم	نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا، جو اس پر واجب آتا ہے
ويسكت بينهم ليسلم ويتكلم ليغنم	اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد سے نہیں بڑھتا
ان احسن استبشر وان أساء استغفر،	دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
وان عتب استعتب، وان سفه عليه	معصیت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو نماز
حلم، وان ظلم صبر وان جير عليه	میں خشوع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے، اس کا کلام

عدل ولا يتعوذ بغير الله ولا يستعين الا بالله وقورٌ في الملاء، شكورٌ في الخلاء قانع بالرزق، حامد على الرخاء، صابر على البلاء ان جلس مع الغافلين كتب من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين كتب من المستغفرين، هكذا كان اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، الاول فالاول حتى لحقوا بالله عزّوجلّ وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح وانما غير بكم لما غيرتم "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ"[1]

شفار کا پیام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سراسر غور و فکر اس کی نظر سراپا درس و عبرت ہے علما کی صحبت اختیار کرتا ہے علم کی خاطر خاموش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہوں اور گرفت سے محفوظ رہے بولتا ہے تو اس لئے کہ کچھ (ثواب) کمائے اور فائدہ حاصل کرے، نیکی کرکے اس کو خوشی ہوتی ہے غلطی ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے شکایت کرتا ہے اور اس کے دل میں کسی کی طرف سے رنج آتا ہے تو معافی تلافی کر لیتا ہے اس سے کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے ظلم کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس کے حق میں ناانصافی کرے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کے سوا کسی سے مدد نہیں چاہتا مجمع میں باوقار تنہائی میں شکرگذار رزق پر قانع، آرام و عیش کے زمانہ میں شاکر مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر، غافلوں میں ذاکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شاغل، یہی شان اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنے درجوں اور مرتبہ کے مطابق جب تک دنیا میں رہے اسی شان سے رہے اور جب دنیا سے گئے تو اسی آن بان سے گئے، مسلمانو تمہارے سلف صالحین کا یہ نمونہ تھا جب تم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا تو اللہ نے بھی تمہارے ساتھ اپنا معاملہ بدل دیا (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ) "اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک یہ لوگ خود اپنی (صلاحیت) کی حالت کو نہیں بدل دیتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا تجویز کرتا ہے تو پھر اس کے ٹلنے کی کوئی صورت ہی نہیں اور کوئی خدا کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا)

[1] الحسن البصری لابن الجوزی ص ۶۹۔

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرامؓ کو یاد کرتے ہوئے اور سورۃ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا:۔

ان المؤمنين لما جاءتهم هذه الدعوة من الله صدقوا بها وافضى يقينها الى قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم وابصارهم كنت والله اذا رأيتهم رأيت قوما كانهم راى عين والله ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم جاءهم امر عن الله فصدقوا به فنعتهم الله في القرآن احسن نعت قال "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" والهون في كلام العرب اللين و السكينة والوقار "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا" حلماء لا يجهلون وان جهل عليهم حلموا يصاحبون عباد الله نهارهم بما يسمعون ثم ذكر ليلهم خير ليل فقال "وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا" ينتصبون لله على اقدامهم ويفترشون وجوههم

مومنین (اوّلین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار پہونچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی، اور اس پر لبیک کہا، اس کا یقین انکے دلوں کی گہرائی میں اتر گیا، ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں بخدا میں جب ان کو دیکھتا تو صاف معلوم ہوتا کہ دین کے حقائق اور غیب کی باتیں گویا ان کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں ان کو بحث و مباحثہ اور فضول باتوں سے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز پہونچی، اور انھوں نے مان لی، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "رحمٰن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں" آیت میں "ھونا" کا لفظ آیا ہے "ھون" کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں پھر فرمایا "اور جب ان سے بے سمجھ لوگ بات کریں تو کہتے ہیں سلام" ہے یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں جہالت پر نہیں اترتے اور اگر کوئی دوسرا جہالت پر اتر آئے تو ان کے حلم و وقار میں فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کی

سجدا الى ربهم تجرى دموعهم على خدودهم فرقا من ربهم لامر ما سهروا ليلهم ولامر ما خشعوا نهارهم قال" الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا" وكل شئ يصيب ابن ادم ثم يزول عنه فليس بغرام، انما الغرام اللازم له ما دامت السَّمٰوٰت وَالْاَرض صدق القوم والله الذى لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فعملوا وانتم تمنون، فاياكم وهذه الامانى، رحمكم الله فان الله لم يعط عبدا بامنيته شيئا فى الدنيا والاخرة۔[1]

بات سننے کے لئے دن گذارتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی راتیں گزرتی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ خود تعریف کرتا ہے" اور وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدہ میں اور کھڑے ہو کر رات گزارتے ہیں" واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے، چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدہ میں پڑ جاتے، ان کے رخساروں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا خوف ان کی آنکھوں کو اشکبار رکھتا، آخر کوئی تو بات تھی جس کے لئے وہ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے، کوئی تو بات تھی جس کے باعث وہ دن میں سہمے سہمے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے بیشک اس کا عذاب بڑا تاوان اور بلائے جان ہے" آیت میں غرام کا لفظ آیا ہے، جو مصیبت انسان کو لاحق ہو اور ٹل جائے اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت ہے جو قیامت تک انسان کے سر سے نہ ٹلے، قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں) سچے اور پکے ثابت ہوئے اور جو انھوں نے زبان سے کہا تھا اس پر عمل کیا، لیکن افسوس تم صرف تمناؤں میں مشغول ہو، لوگو! ان خالی تمناؤں سے باز آؤ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو محض اس کی تمنا پر دنیا و آخرت کی کوئی خیر نہیں عطا فرمائی۔

[1] قیام اللیل ص۱۲۱ (محدث محمد بن نصر مروزی تلمیذ امام احمد بن حنبل)

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر مواعظ کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں، لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحرِ علمی، اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرأت و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبد الملک پر برملا تنقید کی، ایک موقع پر برسر درس کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید ابن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ "نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو" ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المومنین کا" یہ سن کر آپ کو غصہ آگیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا" ہاں نہ امیر المومنین کا، ہاں نہ امیر المومنین کا"[1] حجاج کی تلوار اور سفاکی مشہور ہے، مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہارِ حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور "اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً" (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی شان پیدا نہیں ہوئی تھی، خود مسلمانوں کی نئی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکامِ الٰہی کے سامنے

[1] طبقات ابن سعد ج ۷، ص۱۱۸-۱۱۹

"انقیاد و تسلیم" کی خو نہیں پیدا ہوئی تھی، ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امراء و اغنیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال، اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا، یہی لوگ بالعموم زندگی پر حاوی تھے، درباروں میں، حکومت میں کلیدی جگہوں پر فوج میں، بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک وقتی و مقامی بیماری تھی، جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی، اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و مذبذب ہے، اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہوا کفر ہے یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان تذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے، جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے، اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں، اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ و اقتدار کی حالت میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور تذبذب کی حالت میں رہتا ہے، اس کی نفسی کیفیات، اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی، اور کمزوروں اور غریبوں پر دست درازی "منافقین اولین" کی یاد تازہ کرتی ہے۔

"نفاق" و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے، اور منافقین نہ صرف موجود ہیں، بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں دخیل ہیں[1]، اور انہی سے شہروں کی چہل پہل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی "نفاق" پایا جاتا ہے؟ فرمایا:۔

لو خرجوا من ازقة البصرة لاستوحشتم فيها[2]	اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے، یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت سے آراستہ نہیں، ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا:۔

یا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من منافق قهرها واستأثر عليها[3]	خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق غالب آگئے ہیں جو پرلے درجہ کے خودغرض ہیں۔

---

[1] متاخرین میں سے شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے، اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں، نفاق اعتقادی، اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانۂ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق، کثیر الوقوع ہے، وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے "فوز الکبیر" میں ارشاد فرماتے ہیں:۔ "اگر خواہی کہ از منافقاں نمونہ بینی رو در مجلس امراء و مصاحبان ایشاں را بہ بیں کہ مرضی ایشاں را بر مرضی شارع ترجیح می دہند، و انصاف ہیچ فرق نیست درمیان آنانکہ کلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بے واسطہ شنیدہ نفاق درزیدند، و درمیان آنانکہ الحال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شارع معلوم کردہ اند بعد ازاں برایثار خلاف آں اقدام می نمایند و علی ہذا القیاس جماعۃ از معقولیاں کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند و معاد را نسیاً منسیاً ساختہ اند نمونہ آں گروہ اند" (ص۲۱ مطبع محمدی)

[2] صفۃ النفاق و ذم المنافقین، مولفہ محدث ابوبکر فریابی ص۶۸ [3] ایضاً ص۵۷

یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے دلچسپی ہے۔

حسن بصریؒ کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے اس بگڑے ہوئے معاشرہ پر زد پڑتی تھی، وہ "نفاق" کی حقیقت بیان کرتے تھے، اور نفاق ایک مرض تھا جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے، اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے، اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے، اور مترفین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ، اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے اُن سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں، اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گذاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی، عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسنؒ نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا، جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے۔[1]

[1] دائرۃ المعارف للبستانی ج ۷، ص ۴۴

حسن بصریؒ کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا۔ ۱۱۰ھ میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے[1] ان کے جنازہ کی مشایعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی۔[2]

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے "دعوت الی اللہ" دعوت آخرت اور دعوتِ ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس (۲۲) برس بعد خلافتِ امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجائے بغداد دار الخلافت اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

انقلابِ حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوشش بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے، جو امویین اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم کر رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرافتِ نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافتِ اموی اور خلافتِ عباسی کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت سے تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندہ بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کے دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

[1] بصرہ اس وقت عراق کا سب سے بڑا شہر تھا، اور خلافت کے پایہ تخت دمشق کے بعد اسلامی مملکت میں دوسرے درجہ کا شہر شمار ہوتا تھا۔
[2] ابن خلکان (حسن بصری)

واقعۂ کربلا کے بعد بھی خاندانِ نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ وعلی آبائہ السلام) کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علمِ جہاد بلند کیا، اور ۱۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے، امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے، اور حاضر نہ ہو سکنے پر معذرت[1] کی، ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذو النفس الزکیہ (بن عبداللہ المحض ابن الحسن المثنیٰ بن سیدنا حسن بن علیؓ) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالک[2] ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی[3]، اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں، اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلانِ حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگرچہ علاوہ کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر قربانی، اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جواں مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی، اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ"

۱؎ مناقب ابی حنیفہ بزازی۔ ج ۱ ص۵۵

۲؎ امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذو النفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ ص۲۱۴)

۳؎ مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ ان کا عہدۂ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" از مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔

خلافتِ عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر

خلافتِ عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافتِ عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیاداری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور برے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی، اس کی خرابیاں، اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی، اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:۔

امطری حیث شئتِ فسیاتینی خراجک۔

جہاں تیرے جی میں آئے جا کر برس جا تیری پیداوار کا خراج بہرحال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنتِ عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو قنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ۳۱۵......) سالانہ سے زائد[1] جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، مامون کے زمانہ میں اس میں

۱؎ مقدمۂ ابن خلدون ص۱۵۱

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامانِ عیش وعشرت اور ساری دنیا کے اہلِ کمال، صنّاع ومغنّی، غلام، باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش وخوش فکر سمٹ کر بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور متمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دار السلام یا مرکزِ اسلام میں شروع ہو گئی تھیں[1]، دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن وتعیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:-

"مامون مع خاندان شاہی وارکانِ دولت وکل فوج وتمام افسران ملکی وخدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس[19] دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کی، خاندان ہاشم وافسران فوج اور تمام عہدہ دارانِ سلطنت پر مشک وعنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں، جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہو اسی وقت وکیل المخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر مشک وعنبر کی گولیاں اور درہم ودینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر ویاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے قدم پر نثار کئے گئے، جو زریں فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے"[2]

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش وعشرت بغداد میں کچھ نفوسِ قدسیہ تھے، جو دعوت الی اللہ، تزکیۂ نفوس، علوم دینیہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الحیوان" (جاحظ) ج ۳ ص ۹۱، وج ۵ ص ۱۱۵ ومجلدات الأغانی۔

[2] المامون (مولانا شبلی نعمانی مرحوم ص ۱۵۷، بحوالۂ ابن خلدون، ابو الفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشر واشاعت اور تعلیم وتعلّم میں ہمہ تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری دلچسپیوں سے اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اس امّت کی روح اور تعلق باللہ کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن وحدیث) کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے ہٹا نہیں سکی، مادّیت کے اس پر تلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے بغداد میں مادی وپر عشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی، جو اپنی طاقت اور وسعت میں مادّی وسیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا غلبہ ثابت ہوتا، سلطانِ وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک واحتشام کے ساتھ رقہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث اور مرد صالح حضرت عبد اللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبد اللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ بادشاہی ہے نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش وعشرت اور مال ودولت کا گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم وعمل، صلاح وتقویٰ اور دعوت واصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات وتراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحاء وعلماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ وقال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ دینی رونق اور عین مرکز حکومت میں دین واصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی

معروف کرخی، اور بشر حافی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال واخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغنا، ایثار و بے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی وقار قائم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال واخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابئی مسلمان ہوتے تھے۔[1]

[1] ملاحظہ ہو تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) اور حلیۃ الاولیاء (ابو نعیم) اور تاریخ ابن خلکان۔

تدوینِ حدیث وفقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت، اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو براعظم (ایشیا و افریقہ) اور براعظم یورپ کا ایک حصہ (اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے متمدن ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ، اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوتِ فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جا سکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جا سکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانونِ سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اگر قانونِ اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی، جس کا نتیجہ وہ ہوتا جو اس وقت کی نام نہاد "اسلامی سلطنتوں" کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت، اور محافظین سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت، اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت سے محروم کر دیتی۔

ع یک لحظہ غافل بودم صد سالہ راہم دور شد

اس وقت دو مسئلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کرلیا جائے، جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں[1] میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچہ کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے وہ زمانۂ نبوت کے تیئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامچہ ہے، جو کسی پیغمبرؑ کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہوجانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت زہد و تقویٰ، اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہلِ دعوت واہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہوسکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیحد متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

---

[1] حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہوچکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی توجہ و دلچسپی کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہوچکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) ابن جریج مکی (م ۱۵۰ھ) ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ) سعید ابن ابی عروبہ مدنی (م ۱۵۶ھ) معمر یمنی (م ۱۵۳ھ) ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہورِ اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا، جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوت حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابۂ کرامؓ نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا، اس کو محفوظ کرلیا، اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابۂ کرامؓ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جیتا جاگتا مرقع پیش کردیا، جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند ہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالےٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پرجوش طالب علم مہیا کردیئے، جو قوت حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالےٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہوگیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دُھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دُھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمائی کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کردی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انھوں نے کھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پاطے کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث اندلس ابن حیوان نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اور یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی، گویا طنجہ سے لے کر سوئز تک سارا برِ اعظم افریقہ اور پھر بحرِ احمر طے کیا، بہت سے محدثین کا سفرنامہ تین تین برِ اعظموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے[1] اس وقت کی متمدن و معروف دنیا کے مغربِ بعید (اندلس) سے مشرقِ بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا تو معمولی بات تھی۔

فنِ اسماء الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کی بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی تحقیق کی، اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا جن کے توسط سے یہ روایات ان کو پہونچی تھیں، اس طرح جس ذاتِ گرامی کے متعلق "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کا وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی، اور اس سلسلۂ روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء الرجال" کا وجود میں آگیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق، اور احساس ذمہ داری کی روشن مثال ہے، اس امت کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے "الاصابۃ فی احوال الصحابۃ" (حافظ ابن حجرؒ) کے انگریزی مقدمہ[2] میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔

> "کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح "اسماء الرجال" کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہو"[3]

---

[1] یہ مثالیں "علمائے سلف" (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب کا عنوان "سفر"

[2] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۴ء [3] خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی۔

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی، اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان کے معاصرین کے بیانات اور ہر قسم کی معلومات یکجا کر دیئے، اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا، خواہ ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

> "راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعات آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی، اور اس کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں ان کو مل سکتا تھا، امام وکیع بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بنا پر وہ خود اُن سے جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے"[1]

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی[2] یہی امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے، صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر کچھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق خاموش رہیں، انھوں نے اشرفیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں سکتا[3] کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے[4]؟

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳۰ [2] ایضاً ج ۶ ص ۲۱۱ [3] ایضاً ج ۶ ص ۴۳۱ [4] خطبات مدراس ص ۵۹، ۶۰

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران وترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جفاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف وکمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں بہم پہونچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ تام اور اپنے موضوع سے عشق وشغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاری جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہلِ علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنالیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔[1]

---

[1] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۸۷

مجالسِ درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ وانہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس وروایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور ائمۂ فن سے تلمذ واستفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالس درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا۔

یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا، تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چبوترے پر بیٹھے تھے، خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار اپنا ایک معتمد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبہ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہونچاتا تھا، اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دواتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئیں، جو لوگ لکھتے نہ تھے، صرف سماعاً شریک تھے، وہ اس تعداد سے خارج ہیں، شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے، اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار، فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے، جو دوات قلم لے کر بیٹھتے،[1] فربری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوّے ہزار آدمیوں نے سنا۔[2]

صحاحِ ستّہ

یہ عمومی ذوق، انہماک، اور جذبۂ مسابقت خالی از حکمت نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ ومستند سرمایہ جمع ہو گیا، جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح وتجدید کا ایک بڑا طاقت ور

---

[1] علمی سلف ص ۶۹ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ وتاریخ ابن خلکان۔ [2] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۹۲

ذریعہ ہے اس سرمایہ میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے، اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں[1] ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع، امام ابوداؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد، امام نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وقیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوینِ فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین، مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب اسلام کی ایسی علمی ضرورت تھی جس کو بالکل موخر نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہونچ گیا تھا معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی اعلیٰ ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری، قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ اور روایات اور روح شریعت سے گہری واقفیت "عہد رسالت اور زمانۂ اصحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

---

[1] شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں "اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع وانھما متواتران الی مصنفیھما وانہ کل من یھون امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المومنین" (ج ۱ ص۱۳۴) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ یقینی طور پر صحیح ہیں، اور ان دونوں کتابوں کی نسبت اپنے مصنفین کی تواتر سے ثابت ہے، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تحقیر کرتا ہے، وہ مبتدع اور اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والا ہے

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کارِ عظیم کے لئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستانِ فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے اپنے تعلق باللہ، للہیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبۂ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور کسی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو دو بار عہدۂ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ[1] کے اظہار میں کوڑے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گذارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تن تنہا حکومتِ وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک و اہل سنت کے طریقہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تن تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراسی ۸۳ ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے جن میں سے اڑتیس ۳۸ ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ۴۵ ہزار معاملات سے۔[2]

---

[1] مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو بیوی کو طلاق ہو جائے گی، اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ [2] فجر الاسلام بحوالہ مناقب ابی حنیفہ للمکی ص ۹۶۔) ج ۲ ص ۱۸۸

شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدوّن کیے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے[۱]، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب الأم جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے، ابوبکر خلال (م ۳۱۱ھ) نے امام احمد کے مسائل چالیس[۲] جلدوں میں جمع کیے[۳]۔

ائمۂ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے ممتاز ملے، جنھوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابویوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے ہارون رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاۃ کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف، اور امام زفر جیسا صاحبِ قیاس نظر آتا ہے، جنھوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبد اللہ بن وہب، عبد الرحمٰن ابن القاسم، اشہب بن عبد العزیز، عبد اللہ ابن عبد الحکم، یحیٰ بن یحیی اللیثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہوگیا، امام شافعی کو بویطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے جنھوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کردیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے "المغنی" جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمۂ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہو جانا اس دین کی

---

[۱] سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ قلائد عقود العقیان۔ [۲] اس کتاب کا نام "الجامع العلوم لامام احمد" ہے، ابوبکر خلال کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۲۶۱ میں ملاحظہ ہو۔

زندگی، اور اس امت کی کارکردگی، کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی علمی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہوگئی، اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بےنظمی اور ابتری سے محفوظ رہ گئی جس کی قومیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہوچکی ہیں، انھوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کردیں، اور ایسے اصول مرتب کردیئے، جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گذارا جاسکتا ہے۔

فتنۂ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفۂ الٰہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا' یہ فلسفہ محض چند خیالات و قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص تصورات اور تجربات وابستہ ہوں' ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں' اللہ کی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسئلہ کیمیاوی طرز کی تحلیل و تجزیہ' اور علمی موشگافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا' اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں' جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جا سکے' اس بارہ میں انسانوں کا ذریعۂ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الٰہی ہے' اسی سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے' اور اسی پر اکتفا کرنا عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے' مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم محکم موجود تھا، اور ان کو اس شغل بے حاصل (الٰہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی' صحابۂ کرام' تابعین' ائمۂ دین' اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے' اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوتِ اسلام' فتح و جہاد' اور زندگی کے عملی مسائل' اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی' جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاط ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے' اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی سے

زیادہ سطحیت اور جدت تھی' اس طرز فکر اور طریقۂ بحث سے متاثر ہوئے' اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق' کلامِ الٰہی' رویت باری' مسئلۂ عدل' تقدیر' جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے' جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے' نہ دنیاوی حیثیت سے مفید' بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوتِ عمل کے لئے مضر۔

معتزلہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معتزلہ کر رہے تھے' جو اپنے وقت کے "روشن خیال" عالم اور پرجوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء کا گروہ تھا' جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھا، اور ان موشگافیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دورِ خلافت تک معتزلہ کو عروج حاصل نہیں ہوا' مامون کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقلیت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی' معتزلہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی دؤاد کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ ہو گیا تھا، اور معتزلہ کے افکار و آراء کا پرجوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعتزال کو حکومتِ وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی' مامون میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبۂ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نوجوانوں کی عجلت پسندی[1] اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد (راج ہٹ) دونوں جمع تھیں' اس کے دربار اور مزاج پر معتزلہ حاوی تھے۔

[1] اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی تفضیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی برہمی پیدا ہوئی' ایک مرتبہ متعہ کے جواز کا اعلان کیا' پھر جب قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے علمی طور پر اس کو قائل کیا تو اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدۂ خلق قرآن[1] اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور بدمقابل تھے، اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبلؒ اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلۂ شیبان میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں[2]، ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہوگئے، اموی حکومت میں وہ علاقۂ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہلِ بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلائی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، ماں نے بڑی ہمت اور حوصلہ مندی سے پرورش کی، گذر اوقات کے لئے برائے نام ایک جائداد تھی، ان حالات نے ان میں تحمّل و جفاکشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کردیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں، نجابت اور صلاحیت کے

[1] خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا دماغی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مورخین نے اعتراف کیا ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظاً و معناً کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑجاتا، محدثین معتزلہ کی ان تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے مضر سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادیٔ آراء کا احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت غلو اور مذہبی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے سارے عالم اسلام کو میدانِ جنگ اور دارالامتحان بنا دیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو قرونِ وسطیٰ میں اربابِ کلیسا نے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہی سختی اور حکومتِ وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال، اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

[2] عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار مثنیٰ بن حارثہؓ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آثار بچپن سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے وقائع نگار تھے اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے اور خبریں بھیجتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے کمسن بھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک معین شخص کو پہنچا دیں، انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی، ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا، جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر ہارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے، ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے، لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے، اس کو نہیں لکھتے تھے، تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت و نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (ہیثم ابن جمیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہوگا۔[1]

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی[2]، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث ہیثم ابن بشیر ابن ابو حازم الواسطی (م ۱۸۳ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثنا میں مشہور ائمہ حدیث عبدالرحمٰن بن مہدی، ابوبکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کی اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہوجائے اور کچھ اجالا ہوجائے۔[3]

بغداد سے فارغ ہوکر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا، اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۱۸۷ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعیؒ سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی، جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدوّن کرچکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہوچکے تھے، امام شافعیؒ احادیث کی صحت و سُقم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرتے اور فرماتے تھے کہ اگر تم محدثین کے یہاں

[1] تاریخ حافظ ذہبی (ترجمہ امام احمد بن حنبل) [2] المناقب لابن الجوزی ص ۲۳ [3] ایضاً

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انھوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے، کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا۔ طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۸ھ میں انھوں نے حج کی نیت سے حجاز، اور وہاں کچھ دن قیام کرکے عبد الرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء یمن کا قصد کیا تھا اور اپنے ہم درس یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی اور مکہ پہونچے، ابھی دونوں طواف قدوم کر رہے تھے کہ عبد الرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے، انھوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انھوں نے ان کو دعا دی، اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمدؒ نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انھوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے، شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک مہینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک مہینہ اور مصارف کثیر سے بچا لیا، اور شیخ کو یہیں پہونچا دیا، امام احمدؒ نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسخ کردوں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور زہری اور ابن المسیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انھوں نے وہاں سماعت کی۔[1]

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوت حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود وہ امام شافعیؒ کے تفقہ، حسن استنباط اور ذکاوت سے متاثر تھے، اور کہتے تھے کہ "ما رأت عینای مثلہ" انھوں نے ان سے اجتہاد کے اصول سیکھے، اور اس کا ملکہ اخذ کیا، اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعیؒ بھی

۱؎ ابن کثیر اور ابن جوزی۔

ان کے بڑے معترف اور قدر داں تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انھوں نے فرمایا "خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقی ولا افقه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)

چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۰۴ھ میں انھوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انھوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سنِ نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں، کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کر سکتا تھا، غرباء کو امراء اور اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہمعصر کا بیان نقل کرتے ہیں:-

لم ار الفقیر فی مجلس اعز منه فی مجلس الی عبد الله، کان مائلا الیهم مقصرا عن اهل الدنیا، وکان فیه حلم ولم یکن بالعجول، وکان کثیر التواضع تعلوه السکینة والوقار اذا جلس فی مجلسه للفتیا بعد العصر لا یتکلم حتی یسال۔[2]	میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلس درس میں معزز دیکھا کہیں نہیں دیکھا، وہ غرباء کی طرف متوجہ رہتے تھے، اور امراء سے بے رخی برتتے تھے، ان میں علم و وقار تھا، ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی، بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، طمانینت اور وقار ان کے چہرے سے عیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لئے بیٹھتے تو جب تک ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمہ اسلاف کی طرح فقر و زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی اور ان کا یہ فقر اختیاری

۱؎ ابن حنبل محمد ابو زہرہ ص ۳۳-۳۴ ۲؎ ترجمۃ الامام ص ۳۵

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطینِ وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مال حلال ہے، اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً چھوڑتا ہوں، وہ محنت کر کے یا اپنی آبائی جائداد کی آمدنی سے گذارا کرتے تھے، اس فقر و تنگی کے باوجود بڑے فیاض اور عالی حوصلہ تھے، فرماتے تھے اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور وہ مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف کر دیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی، وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کر چکا تھا، انھوں نے فتنۂ خلق قرآن میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفۂ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہونچی تھی، معاف کر دیا، فرماتے تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و اوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:-

ما رأيت مثل احمد بن حنبل صحبته	میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس
خمسين سنة ما افتخر علينا بشيء مما كان	ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے
فيه من الصلاح والخير[1]	اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اخفائے حال کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے، اور یہ اس دور میں بڑا سرمایۂ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عارم ابو نعمان سے

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ۹ ص ۱۸۱

نقل کرتے ہیں، کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا، اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبداللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب ہیں، انھوں نے جواب دیا "یا ابا النعمان نحن قوم مساکین" (ابو نعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں) میں ان سے بہت پوچھتا رہا، مگر انھوں نے ٹال دیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فتنۂ خلق قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا اور ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعاء کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے، اور ان کو اپنی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہیں استدراج[1] نہ ہو، کیوں تم نے یہ کیسے کہا؟ میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہم ملک روم میں جہاد کر رہے تھے، رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور ہوا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد کے لئے دعا کرو! ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجنیق بھی چلاتے تھے، اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا، اور سپر کو بالکل آڑ بنائے ہوئے تھا، ہم نے احمد کی نیت کر کے منجنیق چلائی، اس کا سر اور سپر اڑ گئی، یہ سن کر امام احمدؒ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو!

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزو مند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو کوئی کچھ کہے، اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے تواضع اور مسکنت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور فوجی اور سپاہی بھی ان سے مرعوب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

[1] خدا کی طرف سے ڈھیل اور کسی غیر مقبول اور فاسد العقیدہ آدمی کی کرامت اور وجاہت کا ظہور [2] ترجمۃ الامام احمد (ذہبی) ص ۲۱-۲۲

اور وقائع نگار متعین کر دیئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتی رہے، ہجوم دم بہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیب سے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے[۱]، جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انھوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شبِ جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول[۲] کو اس امام سنت نے انتقال کیا[۳]۔

فتنۂ خلقِ قرآن

ماموں نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والیِ بغداد اسحٰق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامۃ المسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے، اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے[۴]۔

یہ فرمان ماموں کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں، اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاۃ کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد ماموں نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

---

[۱] ذہبی ص۲۲ [۲] بخاری تاریخ کبیر و صغیر [۳] جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

[۴] اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور طیفور کی تاریخ بغداد میں موجود ہے۔

سرگروہ ہیں) اس کے پاس بھیج دیا جائے، وہ سب آئے تو ماموں نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انھوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔

انتقال سے پہلے ماموں نے اسحٰق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا، جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون کو بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکارانِ سلطنت اور اہلِ علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحٰق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور مشاہیر علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور مکالمہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، ماموں اس محضر کو پڑھ کر سخت برافروختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو اس کو پا بجولاں اس کے پاس بھیجا جائے، چنانچہ بقیہ تیس[۳۰] علماء میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد ابن حنبل، سجادہ، قواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے جن کو ماموں کے پاس طوس ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علماء تھے، جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رقہ ہی پہونچے تھے کہ ماموں کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہونچے۔

ماموں نے اپنے جانشین معتصم بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسيرة اخيك في القرآن) اور قاضی ابن ابی دواد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنائے رہے، چنانچہ معتصم نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلاء وامتحان میں

اب مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت اور عقیدۂ صحیحہ کی حمایت اور حکومتِ وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہِ محدثین کے امام اور سنت وشریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو رقہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں، تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے، چوتھے دن والیِ بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد! تم کو اپنی زندگی ایسی دوبھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی، اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا، جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا، اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار واصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاد صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاد بلایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:۔

اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ — میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"میں جب اس مقام پر پہونچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدھی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معتصم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاۃ ابن ابی دُواد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابو عبدالرحمٰن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابو عبدالرحمٰن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی دُواد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے، معتصم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا، اور بوجھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہو! میں نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت کی طرف، میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جدِ امجد ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا تمھیں معلوم ہے کہ ایمان کیا ہے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور مالِ غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکالنا، اس پر معتصم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبدالرحمٰن بن اسحٰق کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبدالرحمٰن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں) :-

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معتصم کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو؟ میں کہتا امیر المومنین! مجھے کتاب اللہ یا سنتِ رسول میں سے کچھ دکھایئے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معتصم کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کرلیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کردوں، اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو، میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب اللہ یا سنتِ رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اُکتا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا، اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا، یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اُکتا گیا تو کہا کہ ان کو لیجاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا، اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پائجامہ میں پھر ڈال لیا کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتصم کے پاس پہونچا تو کہا بیٹھ جاؤ، پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بُلا لیا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات مان لو، میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا[1]، میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

[1] معتصم امام احمد کے معاملہ میں نرم پڑ گیا تھا، مگر احمد بن دُواد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتصم اپنے بھائی مامون کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچو، اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، معتصم کرسی پر بیٹھ گیا، اور جلادوں اور تازیانہ لگانے والوں کو بلایا، جلادوں سے کہا آگے بڑھو، ایک آدمی آگے بڑھتا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، معتصم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس ۱۹ کوڑوں کے بعد پھر معتصم میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجیف مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھیڑتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیر المومنین! آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، معتصم پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلاد کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اثناء میں میرے حواس جاتے رہے، جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں کھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرا دیا، تم کو روندا، احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا[1]۔"

بے نظیر عزیمت و استقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک اٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گزرے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو سپاہیوں میں سے تھے، کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل مکھی کی سی تھی ـــ محمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے وقت موجود تھے، بیان کرتے ہیں، کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص۴۱-۴۹ باختصار و تلخیص۔

ہے، لیکن انھوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، ایک مرتبہ پیاس کی بہت شدت ہوئی تو پانی طلب کیا، آپ کے سامنے برف کے پانی کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ نے اس کو ہاتھ میں لیا، اور کچھ دیر اس کو دیکھا، پھر بغیر پیئے واپس کر دیا۔[1]

صاحبزادہ کہتے ہیں کہ انتقال کے وقت میرے والد کے جسم پر ضرب کے نشان تھے، ابوالعباس الرقی کہتے ہیں کہ احمد جب رقہ میں محبوس تھے، تو لوگوں نے ان کو سمجھانا چاہا، اور اپنے بچاؤ کرنے کی حدیثیں سنائیں انھوں نے فرمایا کہ خباب کی حدیث کا کیا جواب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پہلے بعض بعض لوگ ایسے تھے، جن کے سر پر آرا رکھ کر چلا دیا جاتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دین سے ہٹتے نہیں تھے۔

یہ سن کر لوگ ناامید ہو گئے اور سمجھ گئے کہ وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹیں گے اور سب کچھ برداشت کریں گے

امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ

امام احمد کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، اور مسلمان ایک بڑے دینی خطرہ سے محفوظ ہو گئے، جن لوگوں نے اس دینی ابتلاء میں حکومت وقت کا ساتھ دیا تھا، اور موقع پرستی اور مصلحت شناسی سے کام لیا تھا، وہ لوگوں کی نگاہوں سے گر گئے، اور ان کا دینی و علمی اعتبار جاتا رہا، اس کے بالمقابل امام احمد کی شان دوبالا ہو گئی، ان کی محبت اہل سنت اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کا شعار اور علامت بن گئی، ان کے ایک معاصر قتیبہ کا مقولہ ہے کہ :-

اذا رأيت الرجل يحب احمد بن حنبل فاعلم انه صاحب سنة[2]

جب تم کسی کو دیکھو کہ اس کو احمد بن حنبل سے محبت ہے تو سمجھ لو کہ وہ سنت کا متبع ہے۔

---

[1] تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الامام احمد ص ۴۹-۵۰ باختصار و تلخیص۔

[2] ایضاً ص ۱۶

ایک دوسرے عالم احمد بن ابراہیم الدورقی کا قول ہے۔

من سمعتموه يذكر احمد بن حنبل بسوء فاتهموه على الاسلام۔[1]

جس کو تم احمد بن حنبل کا ذکر برائی سے کرتے سنو اس کے اسلام کو مشکوک نظر سے دیکھو۔

امام احمد حدیث میں امام وقت تھے، مسند کی ترتیب و تالیف ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے وہ مجتہد فی المذہب اور امام مستقل ہیں، وہ بڑے زاہد و عابد تھے، یہ سب فضیلتیں اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت و محبوبیت اور عظمت و امامت کا اصل راز ان کی عزیمت اور استقامت اس فتنۂ عالم آشوب میں دین کی حفاظت اور اپنے وقت کی سب سے بڑی بادشاہی کا تنہا مقابلہ تھا یہی ان کی قبولِ عام اور بقائے دوام کا اصل سبب ہے۔

آوازۂ خلیل ز تعمیر کعبہ نیست
مشہور شد ازاں کہ در آتش نکو نشست

ان کے معاصرین نے جنھوں نے اس فتنہ کی عالم آشوبی دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ کی عظمت کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے، اور اس کو دین کی بروقت حفاظت اور مقام صدیقیت سے تعبیر کیا ہے، ان کے ہمعصر اور ہم استاد مشہور محدثِ وقت علی بن المدینی (جو امام بخاری کے مایۂ ناز استاد ہیں) کا ارشاد ہے :-

ان الله اعز هذا الدين برجلين ليس لهما ثالث، ابوبكر الصديق يوم الردة واحمد بن حنبل يوم المحنة[2]

اللہ تعالیٰ نے اس دین کا غلبہ و حفاظت کا کام دو شخصوں سے لیا ہے جن کا کوئی تیسرا ہمسر نظر نہیں آتا، ارتداد کے موقع پر ابوبکر صدیقؓ اور فتنۂ خلق قرآن کے سلسلہ میں احمد بن حنبل۔

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۴۲۱ [2] ایضاً ص ۴۱۸

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب اس امامِ سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں[1]

---

[1] ترجمۃ الامام احمد للذہبی، تاریخ ابن خلکان۔

فتنۂ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا، اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر معتزلہ کی عظمت و اقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بیدخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا، اور قضا، وافتا و حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے، تیسری صدی کے وسط میں ان کا خاصا دور دورہ ہو گیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں، اور ان کی آرا و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے، امام احمد کے بعد حنابلہ میں کوئی طاقت ور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علما نے علوم عقلیہ اور نئے طریقۂ بحث و نظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی، نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ کی مجلسوں

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی، اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلہ بھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر، حاضر جوابی اور علمی موشگافی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے مرعوب ہو رہے تھے یہ صورتِ حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائدِ اسلام، ان فلسفی نما مناظرین کے لئے بازیچۂ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی، اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے نہ تو محدثین و حنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پر ان کا عبور و استحضار۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نورد رہ چکا ہو جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے پست و حقیر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیو قامت انسان کے سامنے پستہ قد انسان اور نو عمر بچے، اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امامِ سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابوالحسن اشعری

ابوالحسن علی نام، والد کا نام اسمٰعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے، ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمٰعیل کے انتقال کے بعد ابوعلی الجبائی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابوالحسن نے ان کی آغوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتمد اور دستِ راست بن گئے، ابوعلی الجبائی اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابوالحسن اشعری شروع سے زبان آور، حاضر جواب تھے، ابوعلی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سرحلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشیں بن گئے،[1] تمام ظاہری قیاسات و قرائن بتلاتے تھے کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشیں ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزاری تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی مسندِ امامت تیار تھی، شیخ ابوالحسن کی طبیعت میں اعتزال کا ردِ عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں، اور اپنے مذہب کی پچ ہے، حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن وہ گھر سے نہیں نکلے، سولہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہونچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

[1] تبیین کذب المفتری از ابن عساکر دمشقی۔ ص ۱۱۷

بھری ہوئی تھی، انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب توبہ کرتا ہوں، اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے[1]" وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت، علمی تجربہ، قوتِ گویائی اور استدلال تحریر اعتزال کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہلِ سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا وکیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔

امام ابوالحسن اشعری کا جذبۂ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جاکر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان سے کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکمِ شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟[2]

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

[1] ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۴۷ [2] تبیین کذب المفتری۔ ص ۱۱۶

صلاحیت تھی، مذہبِ حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الٰہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلا دیدی، وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات و علم و کلام میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہنہ مشق استاد اور ماہر فن مبتدی طالب علموں کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابوعبداللہ بن خفیف اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں :-

"میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابوالحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کرلی، تو ابوالحسن اشعری نے گفتگو شروع کی انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا اور اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں (کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں) وہ یہ سن کر ہنس دیئے[1]"

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداءً خاموش کیوں رہتے ہیں، اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں، اور اعتراضات کو خود رفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہلِ حق کا فرض ہو جاتا ہے[2]"

[1] تبیین کذب المفتری ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۵-۹۶

امام ابوالحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد متکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت وحسن تقریر وقوتِ تحریر کی وجہ سے "لسان الأمۃ" کا خطاب دیا تھا کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابوالحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ "میری یہی سعادت ہے کہ میں ابوالحسن کے کلام کو سمجھ لوں"[1]۔

علامہ ابواسحٰق اسفرائنی کا پایہ علم کلام واصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابوالحسن باہلی (امام ابوالحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابوالحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابوالحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی، جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ[2]۔

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل ومتوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الٰہیات کے بارے میں اور مابعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کرسکے اور اس کے جزئیات وتفصیلات اور ذات وصفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرسکے، اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ وہ بعض پرجوش محدثین وحنابلہ کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلامیہ کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی واعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہوگئے تھے، احتیاط وسکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب وعقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقولھم" اس میں

[1] تبیین کذب المفتری ص۱۲۶ [2] ایضاً ص۱۲۵

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم وعقلاء کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے۔

ابوالحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ وفہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب وسنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کرلی۔ "کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ" میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

أمّا بعد فإنّ من الزائغين عن الحق	حمد وصلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة وأهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
أهواؤهم إلى تقليد رؤسائهم ومن مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من أسلافهم فتأولوا القرآن على آرائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تأويلا لم ينزل الله به سلطانا ولا أوضح	ایسی تاویلات کیں جن کی خدا نے کوئی سند نہیں
به برهانا ولا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
رب العالمين ولا عن السلف	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين[1]۔	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں۔

قولنا الذي نقول به وديانتنا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندين بها التمسك بكتاب ربنا عزوجل	جس پر ہم قائم ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ
وسنة نبينا عليه السلام وما روي	رسول کو مضبوط پکڑا جائے، اور صحابہ وتابعین

[1] کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۵، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

عن الصحابة والتابعين وائمة الحديث ونحن بذلك معتصمون وبما كان يقول به ابو عبد الله احمد بن محمد بن حنبل نضّر الله وجهه ورفع درجته واجزل مثوبته قائلون ولما خالف قوله مخالفون لانه الامام الفاضل والرئيس الكامل الذی ابان الله به الحق ورفع به الضلال واوضح به المنهاج وقمع به بدع المبتدعين وزيغ الزائغين وشك الشاكين فرحمة الله عليه من امام مقدم وخليل معظم مفخم[۱]

اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے اس کو اختیار کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (اللہ ان کے چہرہ کو ترو تازہ رکھے، اور ان کے درجات بلند فرمائے، اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل و معتقد ہیں، اور جو ان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم اس سے علیحدہ ہیں، اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل اور پیشوائے کامل تھے، کہ اللہ تعالے نے ان کے ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور صراط مستقیم کو روشن کیا اور مبتدعین کی بدعات اہل زیغ کی کجروی، اور اہلِ شک کے شکوک کا ازالہ کیا، اللہ تعالے ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلکِ سنت اور عقیدۂ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی تائید نہیں ہے، یہ تو محدثین اور عام حنابلہ کرہی رہے تھے، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا، اور معتزلہ اور دوسرے فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد اہلِ سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

[۱] کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ ص۸

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور منحرف فرقوں کے "معتوب" بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان متشدد محدثین اور جامد حنابلہ کے اعتراضات کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک "زیغ و ضلال" کی بات تھی۔

امام ابوالحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الٰہیات و مابعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیماتِ نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد، اور قیاسات یا یونانی الٰہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور ان کی بنیاد پر مستقل گروہ اور فرقے بن گئے ہیں، ان سے صرف اسی بناء پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے، ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہونچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، نیز فرق باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود اہلِ سنت کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی و نبوتِ محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے اقوال و روایات ہیں، اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے لیکن وہ ان حقائق و عقائد کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز بلکہ وقت کے تقاضے کی بناء پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حسیات سے ہے، اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خواہ مخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے، اور اپنی ذہانت اور زبان آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست نہیں، شریعت کے وکیل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی و حسی حیثیت سے

ان کی تردید اور اہلِ حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سکوت کی وجہ لاعلمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرزِ استدلال پیدا نہیں ہوا تھا لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات وجزئیات پیدا کردیں اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء ومجتہدین نے استنباط واجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث ومسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فتنوں اور الحاد وبے علمی کے حملوں سے بچا لیا، اسی طرح محافظینِ شریعت اور متکلمین اہلِ سنت کا فرض ہے کہ عقائد والٰہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دیں اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت ومدلل کریں، امام ابوالحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ "استحسان الخوض فی الکلام" تصنیف کیا۔

بہرحال انھوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور نارضامندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت وحمایت اور ایمان وعقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرزِ عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً وتحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ وفلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جما دیا، عقائدِ اہلِ سنت اور طریقۂ سلف کی طرف سے پُرزور ومدلل حمایت ووکالت کرنے کی وجہ سے اہلِ سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی، اور وہ احساسِ کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سوادِ امت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے پے در پے حملوں سے پیچھے ہٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہوگئی، ابوبکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سر اٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالےٰ نے امام ابوالحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت واستدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجدد دین ومحافظینِ سنت میں شمار کیا ہے، اور ابوبکر اسماعیلی جیسے بعض اہلِ نظر

نے تجدید دین اور حفاظتِ شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔[1]

ان کی تصنیفات

امام ابوالحسن اشعری نے صرف بحث ومناظرہ اور زبانی تقریر وتفہیم پر اکتفا نہیں کی بلکہ عقائدِ باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس (۳۰) اجزاء میں ہے[2] بعض مؤلفین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں[3] جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب وادیان وفرق کی تردید میں، ان میں ایک کتاب الفصول ہے جس میں انھوں نے فلاسفہ طبائعین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے[4] ابن خلکان نے کتاب "اللمع" "الموجز" "ایضاح البرهان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الافك والتضلیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ وکلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے "کتاب القیاس" "کتاب الاجتہاد" "خبر الواحد" "ابن الراوندی کے انکارِ تواتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۶۸ کتابیں ہیں، جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں "مقالات الاسلامیین" (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال ومذاہب نقل کئے ہیں، ان میں بڑی احتیاط ودیانت سے کام لیا ہے، اور

---

۱ تبیین کذب المفتری ص۵۳ ۲ الاشعری ابوالحسن ۳ تبیین کذب المفتری ص۱۳۶ ۴ ایضاً ص۱۲۸

خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔[۱]

عبادت و تقویٰ

امام ابوالحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجۂ امامت و اجتہاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ سے بھی آراستہ تھے، اور یہ ائمۂ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوالحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باحیا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امورِ آخرت میں مستعد نہیں دیکھا[۲]، متکلم ابوالحسین ہروی بیان کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے[۳]، ان کے خادم بندار ابن الحسین کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن صرف ایک جائداد پر گزر کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ[۱۷] درہم روزانہ تھی۔[۴]

وفات

۳۲۴ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلّہ مشرع الزوایا میں مدفون ہوئے[۵]، ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصرِ سنت کا انتقال ہوگیا۔

امام ابومنصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیائے اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

۱؎ مشہور مستشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں صـ۸۸ پر اور ہیمز نے "مقالات اسلامیین" کے مقدمہ میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابوالحسن) ۲؎ تبیین کذب المفتری صـ۱۴۱ ۳؎ ایضاً

۴؎ ایضاً صـ۱۴۲ و ابنِ خلکان صـ۴۶۵ بحوالہ الخطیب، ۵؎ ابن خلکان صـ۴۶۴۔

متکلم ابومنصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائدِ اسلام کی طرف توجہ کی[۱]، وہ بڑے متوازن دماغ کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں، اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابومنصور نے حشو و زوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نباہنا مشکل تھا، خارج کر دیا، اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابومنصور اور ان کے متبعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدین نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے تیس[۳۰] چالیس[۴۰] سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔[۲]

امام ابومنصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء و متکلمین عقیدۃً و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء و متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابومنصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تاویلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے، جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت، علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالمِ اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انھوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علمِ کلام

۱؎ یہ زمانہ اعتزال کے خلاف ردِّ عمل اور سنی علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابوالحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۳۱ھ) اور سمرقند میں امام ابومنصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں نامور معاصرین کے مقابلہ میں علمِ کلام میں شہرت حاصل نہیں کی اور امام ابومنصور ماتریدی کا مدرسۂ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ ۲؎ عقائد عضدیہ کے تعلیقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل تیس سے زائد نہیں۔ (ابن تیمیہ از محمد ابوزہرہ) صـ۱۸۴

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتبِ خیال میں بڑے جلیل القدر علماءؒ و متکلمینؒ اور اساتذہ پیدا ہوئے جنھوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کردیا، اور ان کی وجہ سے دنیائے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معتزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علماء اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) اور شیخ ابو اسحٰق اسفرائنی (م ۴۱۸ھ) بڑے نامور متکلم اور باعظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی متوفی ۴۷۶ھ اور امام الحرمین ابوالمعالی عبدالملک الجوینی (م ۴۷۸ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابو اسحٰق شیرازی مدرسۂ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی باللہ نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہونچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے نکل آتا، جوشِ عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکاندار اپنا سامانِ تجارت ان پر نثار کرتے، مٹھائیوں، پھلوں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام الحرمین ان کا غاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے اور کہتے تھے، کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔[1]

الپ ارسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام الحرمین کو سب سے بڑا دینی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگراں اور مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس تھے، ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۹۱، ۹۲

وبقی علیٰ ذالک قریباً من ثلثین سنۃ	تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی و دینی
غیر مزاحم ولا مدافع مسلم لہ المحراب	میدان میں ان کا کوئی ہمسر اور حریف نہ تھا اور
والمنبر والخطابۃ والتدریس ومجلس	و منبر کی وہ زینت تھے خطاب و تدریس اور وعظ
التذکیر یوم الجمعۃ۔[1]	و تذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر و رسوخ اور علو مرتبت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کرا دیا، امام الحرمین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی، انھوں نے منادی کروا دی کہ ابوالمعالی (امام الحرمین کی کنیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی، تو فرمایا کہ "جو امور فرمانِ سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے، کیونکہ بحکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم شاہی کے برابر ہے، روزہ رکھنا، عید کرنا یا امور فتویٰ پر موقوف ہیں، بادشاہِ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں" چنانچہ بادشاہ نے اعلان کرا دیا کہ "میرا حکم درحقیقت غلط تھا اور امام الحرمین کا حکم صحیح ہے"۔[2]

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد جو چار سو کے قریب تھے، سب نے دوات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، سال بھر ان کا غم تازہ رہا۔[3]

نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدۃً اشعری تھا اور اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

[1] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۲
[2] اخلاق جلالی ص ۱۱۵، ۱۱۹
[3] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴۳

علماء و اساتذہ کے زیرِ اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت و استحکام بخشا، مدرسۂ نظامیہ بغداد عالم اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا اور پڑھنا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و فکر سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

علم کلام کا انحطاط، فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور

ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتبِ خیال کے علما تمام عالم اسلام، نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابوالحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سرِ نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی ملکۂ استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وقار ایسی ہی طاقتور شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیرو رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل در نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرزِ استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریقِ استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قیل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا خطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے[1]، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور مسلکِ سلف کی صحیح نمائندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

[1] جیسا ابن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً الرد علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کا رواج

دوسری طرف مامون کی قدردانی اور دلچسپی اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہوگئی تھیں، اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعات، عنصریات ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے، جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کے مباحث اور دفتر تھے، الٰہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصنام (دیومالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرۂ نسب ہے، کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوعِ انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہوشربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الٰہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفۂ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پیغمبر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الٰہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بضاعت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفۂ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفۂ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۸ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۳۹ھ) اور شیخ بو علی ابن سینا (م ۴۲۸ھ) کے سے پرجوش وکیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہونچا دیا جو یونانی الٰہیات میں شاید مبدءِ اول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے، جو پیغمبروں کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفۂ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل ماخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشا سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور معقولات کو بھی منقولات بنا دیا۔

جماعت ”اخوان الصفا“ اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالمِ اسلام پر فلسفۂ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہین و متجسس نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں اخوان الصفا کے نام سے فری میسن کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی، جس میں فلسفۂ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا:-

ان الشریعة الاسلامیة قد تنجست — اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے

بالجہالات واختلطت بالضلالات	گندی ہوگئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ
ولا سبیل الیٰ غسلھا وتطھیرھا الا بالفلسفۃ	دھویا اور پاک کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
لانھا حاویۃ للحکمۃ الاعتقادیۃ والمصلحۃ	اعتقادی علوم وحکمت اور اجتہادی مصلحتوں
الاجتہادیۃ وانہ متی انتظمت الفلسفۃ	پر حاوی ہے اب صرف فلسفۂ یونان اور شریعت
الیونانیۃ والشریعۃ المحمدیۃ فقد	محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
حصل الکمال۔[1]	ہوسکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقاء کو خاص ہدایت تھی کہ وہ پختہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمروں کی طرف توجہ کریں، اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں پختگی اور جمود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں[2]۔

انھوں نے اس بحث ونظر کے نتیجہ میں ۵۲ رسالے مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی نمائندگی کرتے ہیں، اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ وادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے، اور جہاں جاتے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہونچ گئے[3]۔

معتزلہ وفلاسفہ کا فرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انھوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات وصفات کے نازک وماوراء عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل کو بازیچۂ اطفال بنا دیا

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص ۲۵۳ [2] ایضاً ص ۲۶۱،۲۶۰ [3] تاریخ فلسفۃ الاسلام ص ۲۵۴

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً متقشف، معاصی سے مجتنب ومحتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے[1]، اور یہ سب ان کے اصول وعقائد کا اقتضا تھا[2]، اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر والحاد وانکار نبوت، انکار معاد اور بے عملی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہوسکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور کہیں جاکر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول وکلیات اور اس کے بنیادی عقائد ومسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق واعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ اتنی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم ورواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ضحی الاسلام ج ۳ فصل اول [2] ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار ہوتا ہے، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ "باطنیت" کے نشان کے نیچے جمع ہوگئے، انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، نہ مسلمانوں کو کفر و الحاد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہوجائیں گے، اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انھوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انھوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔ (سورۂ ابراہیم ۴) — اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اپنی قوم ہی کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کردے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کردی ہے، یہ معنیٰ و مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تواتر و تسلسل سے چلے آرہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آرہے ہیں، اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آرہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ وہ چیز امت تک

منتقل ہوتی رہی، انھوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے، اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں، یا مشکوک ہوجائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہوسکتی ہے، اور اس کے سنگین قلعہ میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں شگاف پیدا ہوسکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انھوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہوتے ہیں، اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں، اور کچھ حقائق، ان حقائق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے، جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، جہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں، اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلا، حقائق کے عالم ہیں، اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز و اشارات ہیں، ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں، ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں، جن کا علم صرف اہلِ اسرار کو ہے، اور انھیں سے دوسروں کو حاصل ہوسکتا ہے، جو ان حقائق تک نہیں پہونچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے، اور نہایت نیچی سطح پر ہے، جو حقائق و رموز کی بلند سطح تک پہونچ جاتا ہے اس کی گردن سے یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں، اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے[1]، یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ — (پیغمبر) اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوئے

---

[1] تعطیل شریعت کا مستقل عقیدہ بھی پایا جاتا تھا، ایک باطنی امام و داعی "سیدنا" ادریس لکھتے ہیں:-
بَعَثَ اللهُ محمد بن اسمٰعيل وهو نبي ناطق بنسخ شريعة محمد صلے الله عليه وسلم (محمد بن اسمٰعیل کو اللہ تعالےٰ نے نبی ناطق کی حیثیت سے مبعوث فرمایا، اور انھوں نے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو منسوخ کردیا) (عاصمة نفوس المهتدين وقاصمة ظهور المعتدين لسيدنا ادريس) معز لدین اللہ فاطمی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف ۱۵۷) ہیں ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کرلیا گیا، اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کرلیا گیا تو انھوں نے نبی، وحی، نبوت، ملائکہ، آخرت اور اصطلاحاتِ شرعیہ کی مَن مانی تشریح کرنی شروع کردی جس کے بعض نادر نمونے یہ ہیں:

"نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوت قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبریل کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا ہے، جنابت سے مراد افشائے راز ہے، غسل سے مراد تجدید عہد، زنا سے مراد علم باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک نہ ہو، طہارت سے مراد مذہب باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب سے برأت، تیمم سے مراد ماذون (اجازت یافتہ) سے علم کا حصول، صلوٰۃ سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفا میں اشاعتِ علم، صیام (روزہ) سے مراد افشائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علم باطن، جہنم علم ظاہر، کعبہ خود نبی کی ذات ہے، بابِ کعبہ سے مراد حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفانِ نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں اہل شہادت غرق کردیئے گئے، آتش نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یاجوج ماجوج سے مراد اہلِ ظاہر ہیں، عصائے موسیٰ سے مراد ان کی دلیل اور حجت ہے[1]، وغیرہ وغیرہ۔"

نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظِ شرعی کے متواتر و متوارث معنیٰ و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم، ایسا کامیاب حربہ تھا، جس سے اسلام کے نظامِ اعتقاد و نظامِ فکر کے خلاف سازش

[1] قواعد عقائدِ آلِ محمد (باطنیہ) تالیف محمد بن حسن الدیلمی یمانی زمانۂ تالیف ۷۰۷ھ صہ ۸-۱۶

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈائنامیٹ کیا جاسکتا تھا اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرونِ ریاست قائم کی جاسکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی، اس نے باطنیت کے اسی حربہ سے کام لیا، اور اس معنوی تواتر و توارث کا انکار کرکے پورے نظامِ اسلامی کو مشکوک و مجروح بنادیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نئی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندستان کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں[1]۔

[1] قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے، اور معنوی توارث و تواتر کا عملاً انکار کیا ہے، ختم نبوت، مسیح و نزول مسیح، معجزات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعات یہ ہیں: "روزہ سال میں ایک ہی مہینہ کا ہے، مگر مہینہ ۱۹ دن کا ہے، روزہ کی ابتدا صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے ۱۱ سال سے ۴۲ سال تک انسان احکام شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے مستحب ہے، عورتوں پر نظر جائز ہے کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانیٔ مذہب (باب) کی ولادت ہوئی ہے، اس کی زیارت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے، ایمان کے بعد کوئی چیز نجس نہیں بلکہ محض مذہب بابی کی پیروی سے آدمی طاہر ہوجاتا ہے، پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی طاہر ہوجاتی ہے، پانی ہمیشہ طاہر و مطہر رہتا ہے، بہائیوں کا قانونِ میراث علیحدہ ہے (حاضر العالم الاسلامی بحوالہ فرنچ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ "بابیت" میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں، اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے منشور کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظام دینی کی تاسیس ہے، درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

ظاہر ہے کہ ان "نکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کرسکتا تھا، لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالمِ اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں پیچیدہ اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنھوں نے قدیم علم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الٰہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزادی سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اغراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، کچھ جذبۂ انتقام میں کچھ اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی ظاہریت اور تقشف کے ردّ عمل میں کچھ بوالہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں کچھ اہلِ بیت کے نام سے، اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کرلی جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں، عالمِ اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں[1]، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صحیح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہو گیا، اس بدامنی کے علاوہ انھوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام الحاد کا دروازہ کھل گیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جس کو علومِ عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دستگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، جو اپنے ذہن خداداد، جودتِ طبع اور دقّتِ نظر میں فلاسفۂ یونان اور بہت سے

[1] باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو "نظام الملک طوسی" ص ۵۶۰، ۵۶۳

قدیم ائمۂ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقہ سے مدوّن کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو وفورِ علم اور وسعتِ نظر کے ساتھ دولتِ یقین سے بھی مالا مال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق، اور ریاضت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ دین کی پیروی اور رسولؐ کے اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالمِ اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالمِ اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالیؒ کی تھی۔

امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، اُن کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الرازکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر جرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام الحرمین کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقا میں جو ۴۰۰ کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (معید) بن گئے، امام الحرمین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحرِ زخار ہے، امام الحرمین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہونچے نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں یہاں تک کہ تقریبات شادی و غمی کا ایک ضروری عنصر تھے،

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسۂ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور منتہائے ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۴ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس، حسن تقریر اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلائق بن گئی، تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امراء اور روساء اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی عالی دماغی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکانِ سلطنت کے ہمسر بن گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبد الغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء اور وزراء اور خود بارگاہِ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی[1]، یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفۂ عباسی (مقتدی باللہ) نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے "مستظہری" رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر قناعت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائرِ ہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلند ہمتی نے ان کو امام اور حجۃ الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۴ ص ۱۰۱

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالیؒ نے خود ان حالات واسباب کو بیان کیا ہے جنھوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا، اور ان کو تعلیم وتدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں:۔

"عنفوانِ شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی، ہر فرقہ اور جماعت سے ملتا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی بچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے، اور میرے دعوی کی دلیل ہے کہ لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حسیات اور بدیہیات کے دائرہ میں ہے لیکن جب زیادہ کد و کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ حواس میں سب سے زیادہ قوی حاسہ بصارت کا ہے لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حسیات سے بھی زیادہ مشکوک اور کمزور نظر آئے، تقریباً دو مہینہ تک میری یہ ارتیابی کیفیت رہی اور مجھ پر سوفسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدیہیاتِ عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن یہ کسی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک وجدانی اور وہبی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے، جو طالب حق معلوم ہوتے تھے متکلمین جو اہلِ عقل و نظر ہونے

کے مدعی تھے باطنیہ جن کا دعوی تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں، اور انھوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہلِ منطق و اہل استدلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریقِ مقابل کے پیش کئے ہوئے ہیں، اور متکلمین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن وحدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدیہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف وتدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقۂ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الٰہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً و اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور نہ مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے، وہ الٰہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھائی ہیں، درحقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الٰہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب "مستظہری" کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دارومدار امامِ وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امامِ وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاجِ دلیل ہے، اور یہ دونوں حد درجہ مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے عملی بھی ہے، میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" اور حارث محاسبی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے، اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق وحال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جا سکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی ان سے مجھے وجود باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اُخروی کی صورت

صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض، اور موانع و علائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سر تا پا علائقِ دنیوی میں غرق ہوں، میرا سب سے افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، جو نہ تو اہم ہیں، اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصولِ شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاحِ حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، چھ مہینے اسی کشمکش میں گذر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا، کہ کوچ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر درپیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہوا تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گذر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا، زبان بھی رک گئی جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھا دوں لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کے اثر سے قوت ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام قوائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطبا نے علاج سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے، اور اس سے مزاج متاثر ہوگیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سود مند نہیں، جو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں، تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطراری کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطائف الحیل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انھوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی، اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہوسکتا ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا، "ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ" پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو مرکزِ حکومت سے دور تھے، انھوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے ایماء سے یہ خدمت ترک کی جارہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہلِ حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور علمی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جارہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفاف رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزلت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ، اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، میں مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منارے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صخرہ کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کرلیتا، سیدنا ابراہیمؑ کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہونچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات، اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں، اور دلجمعی اور سکونِ قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یاب ہوتا رہتا تھا، دس برس اسی حالت میں گذر گئے، ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہوگیا، کہ صوفیا ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں، اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔"

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالیؒ اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور بقیہ عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گذار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلائق کو نفع ہو، الحاد و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :۔

"میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت سے مدعیانِ تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بےعلمی اور متکلمین کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی، اہلِ شہر کی عادت کی پیروی، اور اپنی حفاظت کے لئے، بعض احکام شرعی کی مادی منفعتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جا سکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور بآسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہئے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہونچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پا سکے گا، عہدِ نبوت سے بہت بُعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلقِ خدا کو ان کی محبوب و مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالف ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطانِ وقت دین دار اور صاحبِ اقتدار

ہوتا، میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیا، اور اپنے لئے عزلت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا، لیکن اللہ تعالےٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطانِ وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہونچنے کا تاکیدی حکم دیا، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضگی تک نوبت پہونچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہو گی، اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے :۔

"أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝" نیز اپنے رسولِ کریم سے جو اس کے بندوں میں سب سے معزز و مکرم تھے، اس کا ارشاد ہے :۔

"وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ ۝"

میں نے چند اہلِ قلوب اور اہلِ مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انھوں نے بھی بالاتفاق مجھے ترکِ عزلت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متواتر خواب بھی دیکھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے، جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالےٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کارِ عظیم کا ارادہ کر لیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت ۱۱ سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تھی جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیرآباد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہوگیا، اسی طرح سے اس عزلت کے زمانہ میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہوگیا۔"

غرض ذیقعدہ ۴۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رُخ کیا، اور مدرسۂ نظامیہ کی مسندِ درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس و افادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالیؒ کے درس و تدریس اور اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلۂ کار سمجھتے تھے، چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں:۔

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے لیکن درحقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہونچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہوجائے گا، لیکن اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی گمراہی اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کرسکتا ہے، دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہوجائے، اور اس کے

فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کردے، اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔"[1]

امام غزالیؒ کا تجدیدی کام

امام غزالیؒ نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔

۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عملِ جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفۂ الحاد، باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب دہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وکیل تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپر بننے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، فلسفہ "جن" مفروضات" پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابوالحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعانہ تھا، امام غزالیؒ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد "مقاصد الفلاسفہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، الٰہیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کردیا، کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے وضاحت کے ساتھ

---

[1] المنقذ من الضلال ص ۲۸ تا ۳۰ مختصراً۔

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات[1] میں قیل وقال کی گنجائش نہیں، اور دین کا اس سے نفیاً واثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الٰہیات سے ہے، منطقیات[2] میں بھی شاذ ونادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات[3] میں ضرور حق وباطل کی آمیزش ہے، اس لئے ان کا موضوعِ بحث دراصل الٰہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تمہید واصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقہ میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "تہافت الفلاسفۃ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے "مقاصد الفلاسفہ" لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الٰہیات وطبیعیات پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کی، اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض واختلاف کو پوری جرأت وقوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت ور اور شگفتہ ہے، کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزِ بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی، اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر شائبہ سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفۂ یونان کو اپنی صف اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے، اور ان سے مساویانہ وحریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے، اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز یہی ہے، کتاب کی تمہید میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل ودماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام وقیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سقراط وبقراط، افلاطون وارسطو کے پرہیبت نام سنے، اور ان کی شان میں ان کے مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیات، منطقیات، طبیعیات والٰہیات

میں انھوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں، اور ان کا عقل وذہن میں کوئی ہمسر نہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول وقواعد فرضی ومصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلیداً انکارِ مذہب کو اپنا شعار بنا لیا، اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلاء وحکماء کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکمائے الٰہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال ونظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں[1]"

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زورِ بیان اور طنز آمیز طریقۂ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات وصفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول وافلاک کا پورا شجرۂ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں:۔

قلنا ما ذكرتموه تحكمات وهي على التحقيق	تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور
ظلمات فوق ظلمات لو حكاه الانسان	تحکمات ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
عن منام رأه لاستدل على سوء مزاجه[2]	کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے
	تو اس کے سوء مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

لست ادري كيف يقنع المجنون من نفسه بمثل	مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
هذه الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذين	باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے چہ جائیکہ وہ عقلاء
يشقون الشعر بزعمهم في المعقولات[3]	جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

[1] تہافت الفلاسفہ ص ۲-۳ مطبع علامیہ مصر [2] ایضاً ص ۲۹-۳۰ [3] ایضاً ص ۳۳

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

انتھی بھم التعمق فی التعظیم الی ان ابطلوا کل مایفھم من العظمۃ وقربوا حالہ من حال المیت الذی لاخبر لہ بما یجری فی العالم الا انہ فارق المیت فی شعورہ بنفسہ فقط، وھکذا یفعل اللہ بالزائغین عن سبیلہ والناکبین عن طریق الھدی المنکرین لقولہ تعالی "مَا اَشۡهَدۡتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَا خَلۡقَ اَنۡفُسِهِمۡ" الظانین باللہ ظن السوء المعتقدین ان امور الربوبیۃ تستعلی علی کنھھا القوی البشریۃ المغرورین بعقولھم زاعمین ان فیھا مندوحۃ عن تقلید الرسل واتباعھم فلاجرم اضطروا الی الاعتراف بان لباب معقولاتھم رجع الی مالو حکی فی المنام لتعجب منہ[1]

(مبدا اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے ان کو اس حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو باطل قرار دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں) اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے، کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی حشر کرتا ہے، جو اس کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ہدایت کے راستہ سے کترا جاتے ہیں جو اس آیت کے منکر ہیں، "میں نے ان کفار و مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش کے وقت" جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں، اور برا اعتقاد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ امور ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قویٰ حاوی ہو سکتے ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے

[1] تہافت الفلاسفہ ص۱۳۱

اتباع کی ضرورت نہیں لامحالہ اس کا انجام یہ ہوا کہ ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان کرے تو لوگ تعجب کریں۔

"تہافت الفلاسفہ" کا اثر

فلسفہ پر یہ دلیرانہ تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا امام غزالیؒ کے سر ہے، بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس کی تکمیل کی، اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی "تشریح" (پوسٹ مارٹم) کا فرض انجام دیا، فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالیؒ ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔

"تہافت الفلاسفہ" نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی، اور اس کی عظمت، ذہنی تقدس کو کافی نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر سو۱۰۰ برس تک اس کے جواب میں کوئی شایانِ شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرجوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بگوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے "تہافت التہافت" کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو فلسفہ غزالیؒ کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو سو۱۰۰ برس تک کے لئے پھر زندگی عطا کر دی۔[1]

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالیؒ نے فتنۂ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بغداد اور

[1] تاریخ فلاسفۃ الاسلام فی المشرق والمغرب محمد لطفی جمعہ ص۲۷

مدرسۂ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفۂ وقت کے اشارہ سے "المستظہری" تالیف کی تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خود نوشت تلاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے، اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجۃ الحق"، "مفصل الخلاف"، "قاصم الباطنیہ"[1] ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواھم الباطنیۃ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہلِ سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کوچوں سے واقف تھے، اور باطنیہ کی اسرار فروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا حربہ فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالیؒ جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالیؒ کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

"احیاء علوم الدین"

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام

[1] ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے "جواہر القرآن" میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقی صاحب "الفیہ" (م ۸۰۶ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات سے ہے[1]، عبد الغافر فارسی جو امام غزالیؒ کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ "احیاء العلوم" کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی[2]، شیخ محمد گازرونی کا دعویٰ تھا، کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیئے جائیں تو میں "احیاء العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا[3]، حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ "منہاج القاصدین" کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تلاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمائی کے بعد کامیابی پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالیؒ اہل وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے "الغزالی" میں لکھا ہے:۔

> "بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھانا کسی سے تسلی نہیں ہوئی آخر تصوف کی طرف رُخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدراہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و منزلت مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیۂ نفس شَتَّانَ بَیْنَھُمَا۔ ع
>
> ایں رہ کہ می روی تو بمنزل نمی رود
>
> آخر سب چھوڑ چھاڑ ایک کملی پہن بغداد سے نکلے، اور دشت پیمائی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی، یہاں پہونچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن

[1] اور [2] و [3] تعریف الاحیا بفضائل الاحیاء (شیخ عبد القادر الحسنی)

ع بیاد آر حریفاں بادہ پیما را

کے لحاظ سے افادۂ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، امیر و غریب، عام و خاص، عالم و جاہل، رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف ہیں، وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھا لیا ہے اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور جنھوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ ہے) وعظ (جس میں عوام کی دلفریبی کے لئے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے، اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی ہے[1]

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لئے آمادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے، جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم و حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں، اور مقصدِ اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الٰہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

[1] الغزالی ص ۶۳، ۶۴

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مغالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علومِ محمودہ اور علومِ مذمومہ، فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، سلاطین و حکام پر جرأت کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلافِ شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالف دین رسوم و بدعات کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور بگڑے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب اور ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے۔

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک امت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یا معشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح اذا الملح فسد

اے جماعت علماء، اے وہ جو شہر کا نمک ہو — بھلا یہ بتلاؤ کہ جب نمک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراضِ قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو الداء العضال فقد الطبيب فان الاطباء هم العلماء وقد مرضوا في هذه الاعصار مرضاً شديداً وعجزوا عن علاجه۔

تیسرا سبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ مریض موجود ہیں اور طبیب مفقود، طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری طرح بیمار ہیں، اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین وحکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالجملة انّما فسدت الرعية بفساد الملوك وفساد الملوك بفساد العلماء فلولا القضاة السُّوء والعلماء السُّوء لقل فساد الملوك خوفاً من انكارهم۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین کی خرابی ہے اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا ناترس قاضی اور علماء سو نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمۂ حق عند سلطان جائر کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرأت و بیباکی اور احتساب و انکار کے مؤثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان' ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں' اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو' چونکہ ان کی نیت خالص تھی' اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے' اور بڑے سے بڑے سنگدل متاثر ہوتے تھے' اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں' اور وہ خاموش ہیں' اگر بولتے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی' اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں' اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص۳۳۳۔

کا نتیجہ ہے' اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے' اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے' اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابر"۔[1]

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم کا تمام فقہ کی جزئیات اور اختلافی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپہ چپہ پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی' اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور غلو اتنا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمتِ دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے' حد یہ ہے کہ اصلاحِ نفس' تہذیب اخلاق اور سعادت اُخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی' امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر و شکر، خوف و رجاء وغیرہ یا بغض و حسد و کینہ' ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص و توکل اور ریاء سے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے' اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ لعان و ظہار سبق و رمی کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر سنا دے گا جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بتانے والا ہر وقت موجود ہے' لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے' اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص۳۱۲۔

مغالطہ دیتا ہے، اور دوسروں کو بھی، حالانکہ سمجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہوتا تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھتا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہیے مثلاً کتنے شہر ہیں، جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جا سکتی، لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کمی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو، اس کے بالمقابل علم فقہ بالخصوص خلافیات وجدلیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بتلانا ہے، میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں، جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے، اور ایسے فرض کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے، جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں، کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقاف کی تولیت، وصیتوں کی تنفیذ اور یتیموں کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضاء و افتاء پر تقرر اور ہمعصروں اور ہمچشموں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت و غلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں۔[1]"

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں، جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں، اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں، زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طب ہی کو لیجیے کہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس شغلہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اسی طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے)[2]"

وہ ایک جگہ عام جہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ا ص ۱۹ [2] ایضاً ص ۳۸۵

"اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے، یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کہ پھر اس نادر الوقوع جزئیات دور از کار تفصیلات اور ان علوم میں موشگافی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں۔[1]"

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علماء نے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنا لیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم، فقیہ اور صاحب فتویٰ تھے، ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں منہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا، تو وہ ایک دوسرے پر محمول کرتے اور ہمہ تن متوجہ الی اللہ رہتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آئی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے، اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینی پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان سے وہ فتویٰ حاصل کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے، جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور سلف کی شان تھی، جب ان کو بلایا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور عہدۂ قضاء اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوشش پیش آتی، ان کے زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہل علم کا یہ استغناء اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصولِ جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضاء و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے بس وہ اسی طرف متوجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیشکش کی اور

---

[1] احیاء علوم الدین ج ا ص ۳۸-۳۷

ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار بنے بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیدواری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے' اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا، اور عامیانہ اور مبتذل سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے' اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغنا اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے' اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوگئے' البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ اللہ کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت' اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی' اور انتظامات اور مقدمات کے سلسلہ میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی' اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و عقائد سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فریق کے دلائل و مباحث سنیں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں' لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے' مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنا دیا' ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جوابدہی' سنت کی نصرت' اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے' ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں مشغولیت سے مقصود محض دین' خدمتِ خلق' اور بندگان خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے' اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے' جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے' ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب' جنگ و جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے' ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی' اور اس تحقیق کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی میں سے کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے یہ دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوع سخن بنا لیا، اور امام مالک' امام سفیان ثوری' اور امام احمد وغیرہ کے مذاہب و اختلافات کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات سے حکام کو دلچسپی نہ تھی) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی باریکیوں کو

ظاہر کریں' مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں' اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں' انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں' اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی اور یہ شغلہ ابھی تک جاری ہے' ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا تو در اصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی دلچسپی اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا' اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے دلچسپی ہو جائے تو علماء بھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے' اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور بحث و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفاسد اور اس کے شرور و آفات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے' اس لئے اس سلسلہ میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے' اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔[2]

اس سلسلہ میں ایک بڑا مغالطہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم مروجہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے' وہ قدیم الفاظ تھے' جو قرآن و حدیث صحابہؓ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں' مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر الوقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشتغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلق علم کا لفظ بولا جاتا تھا' علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو "توحید" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا' بے سروپا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو "تذکیر" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا' ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارتوں کو "حکمت" کا خطاب دیا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشتغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے' جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں' مثلاً فقہ

[1] احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۳۸
[2] ملاحظہ ہو احیاء العلوم ج ۱ ص ۳۰-۴۳

کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات وجزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت "لِیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ" اور حدیث "مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ" فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے "وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" کی بشارت[1]، جاہل اور ناخدا ترس واعظوں کے عامیانہ مواعظ کے لئے "فَذَکِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ" اور دوسری آیات واحادیث منطبق کی جاتی تھیں، امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا، اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں، اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوتے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں، قرونِ اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک دلچسپ روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تاریخ ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے، جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں[2]۔

حکام وسلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین وامراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دوسو برس پہلے حضرت عبداللہ ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء وسلاطین) کے گروہوں کو دین کا بگاڑنے والا قرار دیا تھا۔

وھل افسد الدین الا الملوک　　　واحبار سوء ورھبانھا

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان، اور ہر طرح کے قوانین وضوابط سے بالاتر تھے، اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا، اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

[1] چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں بلکہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

[2] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ بیان مابدل من الفاظ العلوم۔ ج ۱ ص ۲۸، ۳۴

تھا، امام غزالی نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی ھذہ الاعصار، والحلال فی ایدیھم معدوم او عزیز[1]۔

بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرمت سے خالی نہیں، حلال مال ان کے پاس یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلھا او اکثرھا وکیف لا والحلال ھو الصدقات والفیئ والغنیمة ولا وجود لھا ولیس یدخل منھا فی ید السلطان ولم یبق الا الجزیة وانھا توخذ بانواع من الظلم لا یحل اخذھا بہ فانھم یجاوزون حدود الشرع فی الماخوذ والماخوذ منہ والوفاء لہ بالشرط ثم اذا نسب ذالک الی ما ینصب الیھم من الخراج المضروب علی المسلمین ومن المصادرات والرشاد صنوف الظلم لم یبلغ عشر معشار عشیرة[2]۔

سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں، یا ان میں کا بڑا حصہ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ حلال مدیں زکوٰۃ، فئے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا کہیں وجود نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہونچنے نہیں پاتی لے دے کے صرف جزیہ کی مد ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ مختلف ظالمانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں عمال سلطنت حدود شریعت سے تجاوز کرتے ہیں نہ مال کی مقدار میں شریعت کا کچھ پاس کیا جاتا ہے نہ ذمی جن سے وصول کیا جاتا ہے ان کے بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے نہ اس کے شرائط پورے کئے جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج مالوں اور جائدادوں کی ضبطی رشوت اور انواع واقسام کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے، اس کو

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۱۲۰۔　[2] ایضاً ص ۱۲۲

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہ اور ناجائز نہیں ہیں، اس لئے کہ اس میں بکثرت دینی مفاسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جا سکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحاء نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں:۔

"دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دلجوئی اور استمالت کا خیال رہا کرتا تھا، اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس یہ رقمیں اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر حرف آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور مسرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بددعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلافِ شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے، اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جتنا ان کو سلاطین سے فائدہ پہونچا ہے اتنا ہی ان کو سلاطین کے اس تعلق سے دینی نقصان پہونچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

لیکن اس کے برعکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر و غائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے، اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا، تیسرا تعریف و دعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربارداری جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت، دوستی اور حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو، یہ سلاطین ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے، اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرأت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاط کی ضرورت پیش آوے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دبنا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی ..... تفصیل معلوم ہو گئی تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جزو قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا مستحق ہے اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو تو پھر (مسلک کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے مکروہ ضرور ہے۔[1]

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۱۲۳۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں :۔

الحالة الثانية ان يعتزل عنهم فلا يراهم	دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ
ولا يرونه وهو الواجب والسلامة	تھلگ رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے، اور یہ واجب
فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على	ہے اور اسی میں حفاظت ہے، انسان کو ان کے مظالم کی بنا
ظلمهم ولا يحب بقائهم ولا يثنى	پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہیے وہ نہ ان کی
عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب	زندگی کا خواہشمند ہو، نہ ان کی تعریف کرے، نہ ان کے
الى المصلين بهم۔	حالات کی جستجو رکھے، نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی، اور جب شبہ پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مالیات، آمد و صرف پر یہ کھلی ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک اچھا خاصا جہاد تھا، جس کی نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جا سکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمۂ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا بیٹا سلطان سنجر پورے خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے خطاب کر کے کہا کہ :۔

"افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں، اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے۔"[1]

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیجا، جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا، اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔[2]

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی در و بست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے، اس لئے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزراء کی طرف توجہ کی، ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے، اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدنظمیوں، حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف توجہ دلائی، اور خدا کا خوف دلا کر اور پچھلے وزراء اور صدورِ حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف متوجہ کیا، ان کے یہ خطوط شخصی جرأت، اظہارِ حق اور تاثیر، و قوت انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"بداں کہ ایں شہر از قحط و ظلم ویران بود و تا خبر تو از اسفرائن و دامغان بود ہمہ می ترسیدند و دہقاناں از بیم غلہ می فروختند و ظالماں از مظلوماں عذری خواستند اکنوں کہ اینجا رسیدی ہمہ ہراس و خوف برخاست و دہقاناں و خبازاں تبدبر غلہ، دوکان نہادند، و ظالماں دلیر گشتند، اگر کسی کار ایں شہر بخلاف ایں شکایت می کند دشمن دین تست، بداں کہ دعائے مردمانِ طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را ایں نصیحت بسیار کردم نپذیرفت تا حال وے عبرت ہمہ گشت بشنو ایں سخنہائے تلخ با منفعت، از کسی کہ او طمع گاہ خویش را بہمہ سلاطین وداع کردہ است تا ایں سخن می تواند گفت، و قدر ایں بشناس کہ نہ ہمانا از کسے دیگر شنوی

لے مکتوبات امام غزالی ص۱۹ ۲ے یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور "نصیحت الملوک" کے نام سے موسوم ہے چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی، اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہر کس کہ خبر ایں می گوید با تو طمع وے حجاب است میان او و کلمۂ حق"۔

مجیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اما فریاد رسیدن خلق بر عموم واجب است کہ کار ظلم از حد گذشتہ و بعد ازاں کہ من شاہد ایں حال می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از مشاہدۂ ظالماں بے رحمت و بے حرمت خلاص یابم چوں بحکم ضروری معاودت افتاد ظلم ہمچناں متواتر است"۔

پھر وزرا سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہ کرتے ہیں:۔

"و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدیں بلا مبتلا نبود کہ وے در روزگار ہیچ وزیر آں ظلم و خرابی نہ رفت کہ اکنوں می رود، واگرچہ وے کارہ است ولیکن در خبر چنیں است کہ چوں ظالماں را روز قیامت مواخذہ کنند ہم متعلقاں را و ہم ایشاں را بداں ظلم بگیرند مسلماناں را کار باستخواں رسید و متاصل گشتند و ہر دیناری کہ قسمت کردند اضعاف آں از رعیت بشد و بسلطان نرسید و درمیانہ ارذال عواناں و ظالماں ببردند"۔

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقۂ علما و طبقۂ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے، اس میں جس قدر غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں، ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور عام زندگی سے واقف ہیں، اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، انھوں نے مسلمانوں کی عمومی زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے، جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں، اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافِ شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے، اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے، اور مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے[1]۔

انھوں نے "احیاء العلوم" کا ایک مستقل حصہ (کتاب ذم الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے مغالطوں اور فریبِ نفس میں مبتلا ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے، اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے، اس باب میں انھوں نے علماء، عباد و زہاد، امرا و اغنیا، اور اہل تصوف سب کا جائزہ لیا ہے، اور سب کے خصوصی امراض اور بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے، اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں، جس سے ان کی ذہانت دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علما نے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و خلافیات، علم کلام و مباحثہ و مجادلہ، وعظ و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کے یاد رکھنے پر اکتفا، اس سب پر انھوں نے تنقید کی، اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور خوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی، اور حقیقتِ حال بیان کی، اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرین قیاس ہے کہ "دنیاوی علوم مثلاً طب، حساب اور صنعتوں کے علم میں اس قدر خوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے جتنی علوم شرعیہ میں ہے، اس لئے کہ کسی شخص کا یہ خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعۂ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعۂ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں[2]"۔ اپنے زمانہ کے عباد و زہاد اور اہل تصوف

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین۔ ج ۲ از ص ۲۹۴ تا ۲۹۹ [2] ایضاً ج ۳ ص ۳۴۳

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے، اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے، ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے، اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔[1]

اہل دولت اور اغنیاء پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نہیں کریں گے۔

ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا دو ہزار درہم، بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے؟ اظہار زہد یا شوقِ کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلب رضا، انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمھیں ایسی تدبیر بتلا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو گئی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی، فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے آؤ جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے، صاحب عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور

[1] ملاحظہ ہو احیاء علوم الدین ج ۳۔ از ص ۳۴۵ تا ۳۵۰

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال دے آؤ، اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد، کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت سو نفلی حجوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں نے تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے آؤ، ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہہ دو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجحان غالب ہے، بشر سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے، اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالٰی نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متقین کے عمل کو قبول فرمائے گا۔[1]

دولت مندوں کا ایک گروہ بربنائے بخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادات سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور ختم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مہلک بخل ان کے باطن پر مستولی ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں، جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سکنجبین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفرا کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سکنجبین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے، اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفلی) نمازیں پڑھتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے، اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔[2]"

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۵۱
[2] ایضاً ج ۳ ص ۳۵۲

"عوام دولت مندوں اور فقرا میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس وعظ کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنا لیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجلس وعظ میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مجلسِ وعظ کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل کی محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجلسِ وعظ اور گریہ وبکا کی فضیلتیں سن سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا کہیں پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرانے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الٰہی توبہ! خدایا تیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مریض کی سی ہے، جو کسی طبیب کے مطب میں بیٹھتا ہے، اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع واقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات واعمال کی تشریح وتفصیل کا سننے ربنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی خولی وعظ کو وسیلۂ نجات اور ذریعۂ مغفرت سمجھتے ہو تو دھوکہ میں ہو۔"[1]

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۵۲

ایک اصلاحی وتربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح وتربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح وتربیت اور دوسروں کی تعلیم وتبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے، اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد وفقہ[1]، تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مجموعہ کا نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ "احیاء العلوم" میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چبھ جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے"[2]

مصنف کے ان حالات وکیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں، اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے) پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد وتقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف وہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت ومشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لئے بہت سے مشائخ مبتدیوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبویؐ اور احادیث

[1] امام غزالی چونکہ شافعی ہیں، اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو اختیار کیا ہے۔

[2] الغزالی ص ۴۳

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونۂ کامل کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

احیاء العلوم اور فلسفۂ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ، ایک صاحبِ اجتہاد متکلم اور ایک صاحبِ دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفۂ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی[1] احیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراضِ قلب اور کیفیاتِ نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی دقت نظر اور سلامتِ فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حبِّ جاہ

احیاء العلوم میں "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب الا بشدید المجاھدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے، یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"معلوم ہونا چاہیے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں بعینہٖ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہیے، یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک و لباس کے، اپنی

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاد جامعۃ القاہرۃ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفۃ الاخلاق وصلاتہا بالفلسفۃ الاغریقیۃ"۔

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور ٹھیکریاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہونچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگانِ خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہونچنا، مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہونچنے کے مقابلہ میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہونچنا چاہے گا تو نہیں پہونچ سکے گا اس لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ بآسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آ جائے، چوری یا غصب کے ذریعہ تلف ہو جائے، بادشاہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محافظوں، پہرہ داروں اور محفوظ صندوقوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے،

توان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں' جو چوروں' غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب سے محفوظ ملکیت زمین اور جائداد ہے' لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے' اور پہرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے' لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں' اور جاہ کو کسی غصب و سرقہ کا خطرہ نہیں' ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جا سکتا ہے' اور جس سے عقیدت مندی ہے' اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جا سکتا ہے' اور بدگمانی پیدا کی جا سکتی ہے' لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں ازدیاد و نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے' اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں' اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ بگوش اور معتقد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں' لوگ دوسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں' اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں' اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے' اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے نئے نئے دل شکار ہوتے ہیں' اور اس کے حلقہ بگوش بنتے ہیں' اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے' اور کہیں جا کر رکتی نہیں' برخلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے' اس میں بغیر سخت محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا' لیکن جاہ خود بخود نمو پذیر ہے' اور اس کی کوئی حد نہیں' مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے' جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے' اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے' اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے' اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں' تو مال و دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے' یہ تو مال کی جاہ پر ترجیح کے نمایاں اسباب ہیں' اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کرکے اور کلفتیں دور کرے' اس لئے کہ مال وجاہ محبوبات کا ذریعہ ہیں' اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے' لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی' اور انسان اموال کے جمع کرنے خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے' یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے' اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہونچ جائے' جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا' اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے' یا اس کی غرض برآری کریں گے' یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے' اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو' اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو' بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں' آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے' جس کا ازالہ ممکن نہیں' اس کے دو سبب ہیں' ایک[۱] جلی جس کا ادراک سب کر سکتے ہیں' ایک[۲] خفی جو بڑا سبب ہے لیکن اتنا نازک ہے کہ غبی تو غبی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں' اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت سے ہے جس کا علم باریک بین اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے' اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

ع عشق است وہزار بدگمانی

انسان کی بسر اوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو' لیکن اس کی آرزوئیں بہت

طویل ہوتی ہیں، اس کے دل میں باربار یہ خطرہ گذرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہوجائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو، جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکروغم کا جوش اٹھتا ہے، یہ خلش اس کی جبھی دور ہوسکتی ہے، جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہوجائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہوگیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے دلچسپی اور زندگی کی محبت کی بناء پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے، اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حق رکھتا ہے، اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے، اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے، اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکرمندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جاکر نہیں ٹھہرتا، یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنالینے کی ہوس پیدا ہوجاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص، اور مال کا حریص" بعینہٖ یہی علت دوردراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حب جاہ کا مریض بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آسکتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑجائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت ولذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑسکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک امر ربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے "وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہوسکتا ہے کہ قلب میں ایک تو بہیمی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات قتل وضرب وایذا کا، اور ایک شیطانی صفات مکروفریب کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفات ربوبیت کبروعظمت، عزت وتجبر اور سربلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول وعناصر سے مرکب ہے، جن کی شرح وتفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے اس کی بناء پر انسان کے اندر طبعی طور پر ربوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، ربوبیت کیا ہے؟ کمال میں یکتائی اور مستقل وجود جو کسی کا شرمندۂ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفاتِ الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو بالطبع محبوب ہے، اور کمال یہی ہے کہ وجود میں یکتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرۂ کمال کے لئے داغ ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں یکتا نہ ہوتا اور وجود کی یکتائی اللہ تبارک وتعالےٰ ہی کو حاصل ہے، اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے تو درحقیقت اس کے سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ معیت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات کمال کے لئے نقص ہے، کامل وہی ہے، جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوارِ قدرت کی تابش کا فیضان

ہے' یہ سب تابع ہیں' متبوع نہیں' پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے' اور یہی کمال ہے' انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو' بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے' جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا[1] عبودیت نفس اسی لئے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے' یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے' جس کی طرف "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہونچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکلیہ زائل نہیں ہوئی' اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متمنی ہے' اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے' کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر' دنیا میں جو بھی موجود ہے' اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت ہے' اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا نامرغوب ہے' اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفاتِ کمال کا فنا سمجھتا ہے' کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی' اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہینِ منت ہو' اگر وہ تمہارا رہینِ منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو' اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے' اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے' ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے' وہ اپنی ذات کا عاشق ہے' اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے' اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے' اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی یہ ہیں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو' انسان نے چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں سے کچھ موجود ایسے ہیں جو

---

[1] مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:۔

نفس ما را کمتر از فرعون نیست — لیک او را عون ما را عون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے' جیسے اللہ کی ذات وصفات' اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں' لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں' اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا' جیسے افلاک' کواکب' ملکوت سماوات' نفوس' ملائکہ' جن وشیاطین اور جیسے پہاڑ وسمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں' تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے' جیسے زمین اور اس کے اجزاء' معدنیات' نباتات' حیوانات' اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں' جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں' جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے' جیسے ارضیات' اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا' جیسے ذات الٰہی' ملائکہ' افلاک' تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے' ان کی حقیقت کو سمجھے' اور ان کے اسرار کو فاش کرے' اس لئے کہ یہ بھی ایک طرح کا غلبہ ہے' اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے' وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے' اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے' (گویا اس علم سے اس کے جذبۂ حکومت واستعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت' ملائکہ' افلاک' کواکب' عجائب' سمٰوات' سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے' اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا' وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے' (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شطرنج وضع کرنے سے عاجز ہے' وہ کم سے کم شطرنج کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے' اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شطرنج کیسے بنائی گئی ہے' جو شخص کسی ہندسہ یا شعبدہ یا جر ثقیل کے آلے کو دیکھتا ہے' اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آلہ بنانے سے قاصر ہے' تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے' اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے' گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کرسکتا ہے جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی منشاء کے مطابق تصرف کرسکے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پیسہ سامان ہے، ان کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے، اور قدرت کمال ہے، اور کمال صفاتِ ربوبیت میں سے ہے، اور ربوبیت بالطبع محبوب، اسی لئے اس کو اموال کی محبت ہے، چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور تغلب سے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کرسکے، یعنی بیگار لے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبہ بھی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا رعب و داب بھی لذیذ اور عزیز ہے جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اور انسان اس کا دلدادہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں، اور یہ روئے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے، اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے مسخر ہو جائیں، اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لئے کہ اس میں غلبہ کا کمال پایا جاتا ہے، اور صفاتِ ربوبیت سے مشابہت ہے، قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں، اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے، اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے اور صفاتِ الٰہیہ سب انسان کو بالطبع محبوب ہیں، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبتِ ربانی پائی جاتی ہے، اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کرسکتی ہے، اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الٰہی تک پہنچنے والی ہے، اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے، اور جس کے لئے قلوب مسخر

ہو گئے، اس کو ان پر قدرت و استیلاء حاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلاء کمال ہے، اور کمال اوصافِ ربوبیت میں سے ہے، پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے، مال و جاہ بھی اسبابِ قدرت میں سے ہیں، اس لئے کہ وہ محبوب کا وسیلہ ہیں، اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے، پھر نہ معلومات کی کوئی انتہا ہے، نہ مقدورات کی کوئی انتہا ہے، اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جاسکتی ہے، اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے جس پر قدرت حاصل کی جاسکتی ہے، تو نہ شوق کو سکون ہے، اور نہ نفس کو زوال، اسی لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو حریص کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے۔[1]

محاسبۂ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے، جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیوہ بیان واعظ، ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر وکالت کرتا ہے، اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مقنن و عالم نفسیات کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیرخواہ مربی کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے اس لئے ان کے مواعظ صرف واعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھے حصہ (ربع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک اقتباس

[1] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۲۴۱، ۲۴۴

پیش کیا جاتا ہے، جہاں انھوں نے نفس کو زجر و توبیخ کی ہے، اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہیے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہیے "المرابطة السادسة فی توبیخ النفس ومعاتبتها" عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

•اے نفس ذرا انصاف کر! اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے، اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمانِ الٰہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے، اگر ایک بچہ کہتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کئے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے، کیا انبیاءؑ علماءؒ اولیاءؒ اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں، اس کے گرز، اس کا عذاب، اس کا زقوم، اور اس کے آنکڑے، اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں، جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے، یہ عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں، اور ان پر تیرا ایمان ہے، تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے حالانکہ موت کمین گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اُچک لے جائے، اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے، وہ کبھی بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے، ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے، اور وہاں کئی سال بیکاری اور تعطل میں گزار دیتا ہے، اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اسکے

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا قضا کا منصب بغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے، تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانع ہے اور آج کل، آج کل کرنے کی کیا وجہ ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے کیا تو اس دن کا منتظر ہے جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا جنت ہمیشہ ناگواریوں اور مکارہ سے گھری رہے گی، اور مکارہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آچکی ہے وہ گذشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے، جس سے ایک درخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزرے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا، بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھیڑیے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب ہے، سرسبز شاخ لچک رکھتی ہے اور جھکائی جا سکتی ہے جب سوکھ جائے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر اے نفس! تو ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور سہل انگاری سے کام لیتا ہے تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے غالباً تو یہ کہے کہ استقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام ومصائب پر بے صبری ہے' اگر یہی بات ہے تو تیری غباوت کتنی بڑھی ہوئی ہے' اور تیرا عذر کتنا لنگ ہے' اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابدالآباد تک کے لئے ہو' اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہوسکتی ہے' اگر تو خواہشات کا حریص ہے' اور تجھے لذت ہی عزیز ہے' تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہئے' اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کردیتا ہے تیرا کیا خیال ہے' اس مریض کے بارے میں جس کو طبیب نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کرسکے' پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے' اس نے اس کو خبردار کردیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے' اگر اس نے بدپرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھولینا پڑے گا' اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین دن صبر کرلینا چاہیے' تاکہ زندگی آرام سے گذرے' یا اپنی خواہش پوری کرلینی چاہیے' پھر تین سو۳۰۰ دن یا تین ہزار۳۰۰۰ دن برابر اس نعمت سے محروم رہے'؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابلہ میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابدالآباد کی زندگی کے مقابلہ میں ہے' (جو اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف' طبقاتِ جہنم میں عذاب نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کرسکتا' وہ عذاب الٰہی کو کیسے برداشت کرسکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے' ایک کفرِ خفی' اور ایک صریح حماقت' کفرِ خفی یہ ہے کہ یومِ حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے' اور ثواب وعقاب سے تو ناواقف ہے' اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر مخفی' اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عفو وکرم پر اعتماد ہے' اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے' غلہ کے ایک دانہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا' بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار جتن کرتا ہے' اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ "الکیّس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والأحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنّٰی علی اللہ الأمانی" (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے' اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے' اور احمق وہ ہے' جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگادے اور اللہ پر آرزوئیں باندھتا ہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہمرنگِ زمین سے ہوشیار رہنا چاہئے تھا' اور شیطان سے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا' تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے' تجھے اپنی ہی فکر کا حکم دیا گیا ہے' دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر' تیرے پاس گنی چنی سانسیں ہیں' اگر تیری ایک سانس بھی رائگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہوگیا' پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے' فراغت کو مصروفیت سے پہلے' دولت کو غربت سے پہلے' شباب کو ضعیفی سے پہلے' زندگی کو ہلاکت سے پہلے' اور آخرت کے لئے تیاری کر' اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے' اے نفس کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا' خوراک کا ذخیرہ' لباس کی ضروری مقدار' اور ایندھن کا ایک ڈھیر جمع نہیں کرلیتا' تو تمام ضروری سامان جاڑے کا مہیا کرلیتا ہے' اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ لبادہ' جڑاول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گذار دے گا' اور تجھ میں اس کی طاقت ہے' کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زمہریر جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے' ہرگز نہیں' اور اس کا کوئی امکان نہیں' شدت وبرودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں' کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کرے گا' جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے' لبادہ' آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی' اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی توحید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی' اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کردیا ہے' اور اسباب آسان کردیئے ہیں' اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو ٹال دے' اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے' وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے اور تجھے چقماق کے طریقہ پر

www.KitaboSunnat.com

پتھروں سے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ توان طریقوں سے فائدہ اٹھائے، اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے، اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور اونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں، انسانوں کی ضرورت ہے اسی طرح طاعت وعبادت سے بھی خدا مستغنی ہے، اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو، "مَنْ اَحْسَنَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَاللّٰهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ" (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے، اور اللہ جہان والوں سے بے پرواہ ہے) تیری خرابی ہو اے نفس! جہالت کی قبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر "مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ" تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برپا کرنا ایک جان کی طرح ہے "كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ" (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اُسے دھراتے ہیں) "كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ" (جیسے اس نے تم کو ابتداءً پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)[1]

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراف کیا ہے، اور لکھا ہے کہ "کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید"[2] (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں، ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں، اور توحید، نبوت اور معاد سے متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں، ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں، وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالف ہیں، مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک آ جاتی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی حس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے اس لئے کچھ عجب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۳۵۸،۳۵۶ ۔ [2] فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ۔

دوسری[2] تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں، جو ابن تیمیہؒ کے نزدیک کتاب و سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں، اور ان کے معیار پر پورے نہیں اُترتے، تیسری[3] تنقید یہ ہے کہ اس میں اہلِ تصوف کے بعض تشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی[4] چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں، بلکہ موضوع روایات تک ہیں[1]، اس کے باوجود شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں:-

وفيه مع ذلك من كلام المشائخ الصوفية	اس کے باوجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو عارف
العارفين المستقيمين في اعمال القلوب	معرفت، استقامت تھے اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا
الموافق للكتاب والسنة ما هو اكثر مما	ایسا کلام ہے، جو کتاب و سنت کے موافق ہے اور جن کا
يرد منه فلهذا اختلف فيه اجتهاد	اکثر حصہ قابلِ قبول ہے، اسی بنا پر اس کتاب کے
الناس وتنازعوا فيه۔[2]	بارہ میں علما مختلف رائیں رکھتے ہیں، اور سب

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے عدم اشتغال ہے[3]، حافظ زین الدین العراقی صاحب الفیہ نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔

ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فروگذاشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔[4]

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراضِ قلب (ریا و حُبِّ جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیئے ہیں جو قابلِ تقلید نہیں ہیں، اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے[5]، ان نقائص کے باوجود وہ

---

[1] فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص ۱۹۴، اور "التاج المکلل" نواب صدیق حسن خاں ص ۳۸۸

[2] فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۲ ص ۱۹۴ [3] المنتظم ج ۹ ص ۱۶۹، ۱۷۰ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۱۶۹

احیاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں، اور انھوں نے خود "منہاج القاصدین" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابلِ اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقلِ محض یا ترجمان و شارح بن کر رہ جائیں، اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے، بدقسمتی سے چوتھی صدی میں علمِ کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں، بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابوالحسن اشعری اور علامہ ابوبکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں، ان کو بھی بعینہٖ تسلیم کیا جائے، اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے۔ امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے، جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفاتِ باری تعالیٰ ...... نبوت، معجزات، تکلیفاتِ شرعیہ، عذاب و ثواب برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال، زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی جس کے لئے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابوالحسن اشعری اور ان کے نامور متبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب مسلکاً اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چیں بجبیں تھا، اور اس حلقہ کے بہت سے پرجوش علماء اس میں "زیغ و ضلال" اور مسلکِ سلف سے بُعد و انحراف محسوس کرتے تھے، احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چہ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں، اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورتِ حال کی اطلاع دیتے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک مستقل رسالہ (فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"برادرِ شفیق! حاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسرارِ دین) پر نکتہ چینی کر رہا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قدمائے اسلام اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر تم کو صدمہ ہوتا ہے، اور تمہارا دل جلتا ہے، میں اس سے واقف ہوں، لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہئے، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مطاعن سے نہ بچ سکے تو میری کیا ہستی ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے،

اس لئے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے' اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے' اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں' اشعری' باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں' اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے اگر کہا جائے کہ اشعری متقدم ہیں' تو خود اشعری سے معتزلہ متقدم ہیں تو پھر معتزلہ کو برحق ہونا چاہیے' یا یہ محض علم وفضل کے تفاوت کی بنا پر ہے؟ تو بتلایا جائے کہ علم وفضل کا موازنہ کرنے کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم وفضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے' اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے' تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں' اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے[1]"۔

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامتِ طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے' اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے' نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے' اور ایک دوا ہے' جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں' عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے' اور جس سے کوئی انسان مستغنی نہیں' وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے' جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے' اور کوئی اس سے محروم نہیں' "إلجام العوام عن علم الکلام" میں جو ان کی آخری تصنیف ہے' لکھتے ہیں۔

فأدلۃ القرآن مثل الغذاء ینتفع بہ	قرآنی دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ
کل انسان وادلۃ المتکلمین مثل الدواء	اٹھاتا ہے' اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں' جس سے
ینتفع بہ آحاد الناس ویستضر بہ الاکثرون	کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس سے
بل ادلۃ القرآن کالماء الذی ینتفع بہ	نقصان ہوتا ہے' بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی ہے

[1] فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ۔

الصبی الرضیع والرجل القوی	جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی یکساں فائدہ
وسائر الادلۃ کالاطعمۃ التی ینتفع	اٹھاتے ہیں' باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے انواع واقسام
بہا الاقویاء مرۃ ویمرضون بہا اخری	کی طرح ہیں کہ کبھی ان سے طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے
ولا ینتفع بہا الصبیان اصلاً[1]	اور کبھی ضرر' اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے' اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں:۔

والدلیل علی تضرر الخلق بہ المشاھدۃ	لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی
والعیان والتجربۃ وما ثار من الشر	دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے' اہلِ تجربہ جانتے ہیں کہ
منذ نبغ المتکلمون وفشت صناعۃ الکلام مع	جب سے متکلمین پیدا ہوئے اور علم کلام کا چرچا ہوا
سلامۃ العصر الاول من الصحابۃ عن مثل	کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی' صحابہ کا دور اس
ذلک[2]۔	خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۴۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسۂ نظامیہ کی مسندِ درس کو دوبارہ آباد کیا تھا' یہ سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت' اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارتِ عظمیٰ کا زمانہ تھا' (فخر الملک) محرم ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا' اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام نے مدرسۂ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی' اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی' گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی' جہاں تعلیم وتربیت میں مشغول ہوگئے۔

۵۰۰ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

[1] الجام العوام عن علم الکلام ص ۲۰ [2] ایضاً

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسۂ نظامیہ میں اگرچہ پُر کردی گئی تھی، مگر خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالمِ اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسۂ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبرو تھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسۂ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، قوام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسۂ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفۂ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لکھتا ہے

"ونیز از سرائے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوان خلافت) ذریعت نمودند و تدبیر آں را مبالغہا فرمودند، وایں خطاب صادر شد تا صدر الدین[1] بہ تحفظ ایں خبر بخواجۂ اجل زین الدین حجۃ الاسلام، فرید الزمان، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی ادام اللہ تمکنہ، اہتمام نگیرد از انچہ او یگانۂ جہاں و قدوۂ عالم وانگشت نمائے روزگار است"

اس فرمان پر دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ "حاشیہ بوسانِ خلافت اور ارکانِ سلطنت سب امام صاحب کے قدوم کے لئے چشم براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا، اس کا ماحصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درسگاہِ عام بن جائے گی لیکن جس طرح آپ مقتدائے روزگار ہیں آپ کی قیامگاہ بھی وہی شہر ہونا چاہیے جو عالمِ اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی وہاں پہونچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دار السلام بغداد ہے"۔

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طول طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھے: ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروفِ تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی، دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ ترکِ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقامِ خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا، اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا اور

۱؎ صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کرسکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کرسکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں" غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کد ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشۂ عافیت سے باہر نہ نکلے[1]۔

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گذارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے، جیسی انھوں نے علومِ عقلیہ اور بعض علومِ نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن الرواسی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا، ابنِ عساکر کہتے ہیں:-

وکانت خاتمۃ امرہ اقبالہ علی حدیث	ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی
المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ومجالسۃ	کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے، اور علماء حدیث
اھلہ ومطالعۃ الصحیحین البخاری ومسلم	کی ہم نشینی اختیار کی، اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا
الذین ھما حجۃ الاسلام[2]۔	مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۴ھ میں انھوں نے "المستصفیٰ" لکھی، جو اصولِ فقہ کے ارکانِ ثلثہ میں شمار کی جاتی ہے[3]، اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتنا کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طابران میں ۱۴ جمادی الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور

۱؎ الغزالی ص ۲۱ ۲؎ تبیین کذب المفتری ص ۲۹۶، ۳؎ یہ تین کتابیں جو اصولِ فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں حسب ذیل ہیں، ابو الحسین البصری کی (المعتمد)، امام الحرمین کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ گنجِ گرانمایہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :۔

"دوشنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بسترِ خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوایا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی"۔[1]

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، اخلاص، علوِ ہمت، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان سے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کروائی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حبِ جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اِس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علوِ ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہمعصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہونچے ان کے کانوں میں یہی صدا آئی کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

[1] اتحاف السادۃ المتقین (شرح احیاء العلوم) صـ ۱۲-۱۱

انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تحشیہ میں مشغول رہے، پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علومِ عقلیہ کی طرف توجہ کی، اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلہ میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فروگذاشت نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوعلی فارمدی (م ۴۷۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہونچے، اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلہ میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں :۔

"امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب احیاء العلوم شائع ہوئی اور ۵۰۱ھ میں اسپین میں پہونچی تو علی بن یوسف بن تاشفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا،[1] اور نہایت بیدردی سے اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت رنج ہوا، اسی اثنا میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیلِ علم کے لئے آیا، جس کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا، یہ ایک نہایت معزز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آبا و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صاحب حوصلہ چلے آتے تھے

[1] شرح احیاء العلوم۔

۔ امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا، اور اپنے ذاتی حوصلہ یا امام صاحب کی فیضِ صحبت سے یہ ارادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو مٹا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے خواہشمند تھے، اس رائے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس مہم کے انجام دینے کے اسباب بھی مہیا ہیں یا نہیں؟ محمد بن عبداللہ[1] نے اطمینان دلایا، تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجازت دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

وبقی فیما زعموا اباحامد الغزالی وفاوضہ	جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے وہ ابوحامد غزالی سے ملا اور
بذات صدرہ فاراد علیہ لما کان فیہ	ان سے اپنے دلی خیالات کے متعلق مشورہ کیا، امام صاحب نے
الاسلام یومئذٍ باقطار الارض من اختلال	اس کی تائید کی کیونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا
الدولۃ وتقویض ارکان السلطان	میں ضعیف ہو رہا تھا، اور کوئی ایسا سلطان موجود
الجامع للأمۃ المقیم للملۃ بعد ان سألہ	نہ تھا، جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور دینِ اسلام کو
عمن لہ من العصابۃ والقبائل التی	قائم رکھے لیکن پہلے امام صاحب نے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے
یکون بہا الاعتزاز والمنعۃ ۔	پاس اتنا سر و سامان اور جمعیت ہے یا نہیں جس سے
	قوت اور حفاظت ہو سکے۔

[1] چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا منشا تھا، اس لئے اس کا ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن السبکی سے نقل کرتے ہیں:۔

"محمد بن عبداللہ اقصائے مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشوونما پایا، پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی، وہ نہایت پرہیزگار، عابد اور قناعت پسند تھا، فارغ التحصیل ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر کمربستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناہی سے روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی، پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا، ۵۰۵ھ میں مہدیہ پہنچا، اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں سے چل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی سے امر بالمعروف کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہِ وقت علی بن یوسف تاشفین نے اس کو دربار میں طلب کیا، دربار کے علماء نے اس سے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت سے ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو؟ محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا یتیموں کے مال پر دست درازی نہیں کی جاتی؟ اس کی پرجوش تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغمات میں آیا، اور رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تینمل میں قیام کر کے قبیلۂ مصامدہ کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع کی اور کامیاب ہوا۔

غرض محمد بن عبداللہ بن تومرت نے واپس جا کر امر بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی، جو مدت تک قائم رہی، اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جور و تعدی بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور عفت مآب خاتونوں کے ناموس کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الٹا دستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے تھے، اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ "ملثمین" کہلاتے تھے، محمد بن تومرت نے اول اول انہی دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملثمین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت قائم ہو گئی، محمد بن تومرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبدالمؤمن تھا تخت نشین کیا، عبدالمؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی، وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی، جو امام غزالی کی منشا تھی، ابن خلدون کتاب ثالث "اخبار بربر" فصل ثالث میں عبدالمؤمن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی، اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر کام کیا جاتا تھا، دادخواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی، رعایا پر عمال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا ڈانڈا ملتا تھا فوجی طاقت سے مضبوط کر دیئے گئے تھے، اور غزوات و فتوحات کو روزافزوں ترقی تھی۔"[1]

[1] الغزالی ص ۱۱۶-۱۱۷ ۔

امام غزالی کا عالمِ اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالمِ اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی تموج اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہونچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی، علمی پایہ، ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر، مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وقیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت، اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں عملی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مداوا ضروری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی، جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو، اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت نے چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصدِ زندگی حصولِ دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، عجمی تہذیب و معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پنجے گڑو رکھے تھے اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم جزو زندگی بن گئی تھیں زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے حکام رس، مزاج شناس موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امراء کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، جو امیرانہ ٹھاٹ سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے، اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایثار و ہمدردی اور جذبۂ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت اور یقین و خودداری سے محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی، جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے، اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت، اس کی بندگی اور رضا مندی میں عالی ہمتی، اور بلند حوصلگی سے کام لے اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واشگاف بیان کیا جائے، اہلِ دنیا اور اربابِ دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تاریخِ اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی، اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور ائمۂ فن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابو اسحٰق شیرازی (م ۴۷۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے متبحر عالم، اور صاحبِ فنون، ابو الوفا ابنِ عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبد القاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) جیسے صاحبِ ذوق اور مجتہد فن، ابو زکریا تبریزی (م ۵۰۲ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابو القاسم الحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے نثار اور صاحبِ طرز نظر آتے ہیں، جنھوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

وقیع دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم وفضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابد جاہل" یا "واعظِ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس وعظ اور حلقۂ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہلِ شک وارتیاب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب و بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکونِ قلب کی نعمت، حقائق ومعارف کے طالبین وشائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوتِ عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دو داعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالےٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سرِ نو ایمانی حرکت و حرارت، اور توبہ وانابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں سے ایک کا نام نامی سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمٰن بن الجوزی ہیں، ذوق ورجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے اور اللہ تعالےٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہونچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام ودعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکزِ اعصاب اور اس کا علمی وسیاسی دار السلطنت تھا، اللہ تعالےٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب حنبلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

تعلیم وتکمیل

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت گیلان[1] میں ۴۷۰ھ[2] میں ہوئی، آپ کا نسب دس واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالی نے تلاش حق وحصول یقین کے لئے بغداد کو خیرباد کہا تھا، یہ محض اتفاق نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر مصلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا،[3] آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ تحصیلِ علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیلِ علم میں قناعت وزہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحبِ فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی، آپ کے اساتذہ میں ابوالوفاء ابن عقیل، محمد بن الحسن الباقلانی اور ابوزکریا تبریزی جیسے نامور علماء وائمۂ فن کا نام

---

[1] جیلان یا گیلان کو دیلم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے جنوب میں برزکا پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں مازندان کا مشرقی حصہ ہے اور شمال میں بحر قزوین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرۃ المعارف)۔

[2] ابن کثیر ج ۱۲ ص ۱۴۹ [3] البدایہ والنہایہ (للبتانی) ج ۱۲ ص ۱۴۹

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس[1] سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید مخرمی[2] سے تکمیل کی، اور اجازت حاصل کی[3]۔

اصلاح وارشاد اور رجوع عام

ظاہری وباطنی تکمیل کے بعد اصلاح وارشاد کی طرف متوجہ ہوئے مسندِ درس، اور مسندِ ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد وشیخ شیخ مخرمی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی توسیع کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کرکے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی وجاہت وقبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحبِ "مغنی" کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیازمندانہ حاضر ہوتے، اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء وفقہاء کا کچھ شمار نہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دواتیں شمار کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلمبند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

محامد واخلاق

بایں رفعت ومنزلت حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

[1] شعرانی نے لکھا ہے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر شائخ اور صوفیہ انہی سے وابستہ تھے ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۲ [2] اصل نام مبارک بن علی بن الحسین ہے، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انہوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم فقہیہ میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس وافتاء سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفات معتدل مسلک رکھنے والے اور اپنے فیصلوں میں بہت صائب الرائے تھے، سنہ ۵۱۳ھ میں وفات پائی۔ [3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات الحنابلہ (ابن رجب)

بات کرنے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، جوں نکالتے، لیکن اس کے برخلاف کسی معزز آدمی اور ارکانِ سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے[1]، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے[2]، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے[3]۔

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسنِ اخلاق، علو حوصلہ، تواضع وانکسار، سخاوت وایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (حرادہ) جنھوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت سے بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:۔

ما رأت عیناي احسن خلقاً ولا اوسع	میری آنکھوں نے حضرت شیخ عبدالقادر سے بڑھ کر
صدراً ولا اکرم نفساً ولا الطف قلباً	کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب،
ولا احفظ عہداً او وداً من سیدنا الشیخ	محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ
عبد القادر ولقد کان مع جلالۃ قدرہ	عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے
وعلو منزلتہ وسعۃ علمہ یقف	کی رعایت فرماتے بڑے کی توقیر کرتے سلام میں سبقت
مع الصغیر ویوقر الکبیر ویبدأ بالسلام	فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ
ویجالس الضعفاء ویتواضع للفقراء	تواضع وانکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی
وما قام لاحد من العظماء ولا الاعیان	سربرآوردہ یا رئیس کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے
ولا الم بباب وزیر ولا سلطان[4]۔	اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

الامام الحافظ ابوعبداللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشبیلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:۔

کان مجاب الدعوۃ سریع الدمعۃ	آپ مستجاب الدعوات تھے (اگر کوئی عبرت اور

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۷ [2] ایضاً ص ۱۲۸ [3] ایضاً ص ۱۲۷ [4] ایضاً

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب	رقت کی بات کی جاتی) تو جلدی آنکھوں میں آنسو
دائم البشر کریم النفس، سخی الید	آجاتے، ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے، بڑے رقیق
غزیر العلم، شریف الاخلاق، طیب	القلب تھے، خندہ پیشانی، شگفتہ رو، کریم النفس،
الاعراق مع قدم راسخ فی العبادة	فراخ دست، وسیع العلم بلند اخلاق، عالی نسب،
والاجتهاد، [1]	عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔

مفتیِ عراق محی الدین ابو عبداللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:۔

ابعد الناس عن الفحش اقرب	غیر مہذب بات سے انتہائی دور، حق اور معقول
الناس الی الحق شدید الباس	بات سے بہت قریب، اگر احکام خداوندی اور
اذا انتهکت محارم الله عز وجل	حدودِ الٰہی میں سے کسی پر دست درازی ہوتی تو آپ کو
لایغضب لنفسه ولا ینتصر لغیر ربه	جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، اور
	اللہ عز و جل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
	کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا
	کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلادوں" یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں، اگر ہزار دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے[2]، صاحبِ "قلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ حکم تھا کہ رات کو وسیع دسترخوان بچھے، خود مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

[1] قلائد الجواہر ص ۹ [2] ایضاً

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے، اور تحمل فرماتے، ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کے یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے، اور اس کی فکر رکھتے، تعلقات کا بڑا پاس اور لحاظ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر قسم کھالیتا تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا اخفا فرماتے"[1]۔

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عز الدین بن عبدالسلام[2] اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تواتر کو پہونچ گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی کرامت مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی، اور عالمِ اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی[3]، شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں[4]۔

جبائی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانۂ سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں، نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے[5]۔

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرتؒ کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

[1] قلائد الجواہر ص ۹ [2] ذیل طبقات الحنابلہ ابن رجب [3] جلاء العینین ص ۱۳۰ [4، 5] قلائد الجواہر و مختلف کتب تذکرہ

بکثرت یہودی، عیسائی، اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے۔[1]

تعلیمی مشاغل وخدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس واخلاق کی اصلاح وتربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس وتدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت وحمایت سے غافل نہ تھے، عقائد واصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہبِ اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ سے بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی وعملی بدعات کا بازار سرد ہوگیا، ابن السمعانی کہتے ہیں کہ متبعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پلہ بھاری ہوگیا۔

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافاتِ ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہبِ شافعی اور مذہبِ حنبلی کے مطابق فتوے دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے اور بڑی تعریف کرتے۔[2]

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء یہ استفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہوسکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ رحمہ اللہ کے پاس استفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ مطاف اس کے لئے خالی کر دیا جائے، اور وہ سات چکر کر کے خانۂ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علماء نے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے، اور اپنی

[1] قلائد الجواہر ومختلف کتب تذکرہ۔ [2] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، وطبقات الحنابلہ ابن رجب۔

قسم پوری کرے، اس لئے کہ طواف بیت اللہ پر موقوف ہے، اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں۔[1]

استقامت وتحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائید غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہونچا دیا تھا کہ حق وباطل، نور وظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہوگیا تھا آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوگئی تھی کہ شریعتِ محمدی کے احکام اور حلال وحرام میں قیامت تک کے لئے تغیر وتبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی، جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبد القادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبد القادر! خدا نے تم کو تمہارے علم وتفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی مہربانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔"[2]

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الٰہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔[3]

[1] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، وطبقات الحنابلہ (ابن رجب) [2] ایضاً ص ۱۲۷ [3] ایضاً۔

تفویض و توحید

تسلیم و تفویض اور توحیدِ کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیاداروں یا امیروں سے اور درد دکھ میں طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریۂ وزاری و حمد و ثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک خلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آرہتا ہے، اور ہمیشہ سوال و دعا، اور گریۂ وزاری اور ستائش و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کو دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (منقطع ہو جاتے ہیں، اور وہ سب سے) علیحدہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے، اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے، تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے، اور روح صرف رہ جاتا ہے، اسے فعلِ حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحبِ یقین موحد ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوا نہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے، اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشایش و بندش، موت و زندگی، عزت و

ذلت، غنا و فقر، اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے، جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کہ الٹا پلٹا جاتا ہے، اور بگاڑا بنایا جاتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں، نہ اپنے لئے، نہ کسی اور کے لئے، یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے، اور اپنے مالک اور اس کے فعل کے سوا نہ کچھ دیکھتا سنتا ہے، نہ کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے، تو اس کی صنعت، اور اگر سنتا ہے، تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (ہر چیز کو) جانتا ہے، اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے، اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے، اس کی تقریب (جاذبہ) سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے، اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے، اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے، اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے، اس کے نورِ معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا خرقہ و لباس پہنتا ہے، اس کے علوم عجیب و نادر پر مطلع ہوتا ہے، اس کے قدرت کے اسرار سے مشرف ہوتا ہے اس کی ذات پاک سے (ہر بات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے، پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے۔"[1]

خلقِ خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی، اور جو نائبین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے، اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے، جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں، ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور دراصل حدیث دیگراں میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔

"اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اللہ سے ان کا دل بھر جاتا ہے، ان لوگوں پر

[1] فتوح الغیب مقالہ (۳) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (رموز الغیب) ص ۱۱، ۱۲، ۱۳

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے' وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے' اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر جلتا رہتا ہے' اور آنکھیں روتی رہتی ہیں' اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں' خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے"[1]

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۷۳ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ ابو العباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد المقتفی لامر اللہ و المستنجد باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخؒ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور معقول[2] خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود

---

[1] فتوح الغیب مقالہ (۲۰) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (رموز الغیب) ص ۱۷۵ [2] ابن کثیر نے اس کے مناقب میں لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، حوصلہ مند، فصیح و بلیغ، شیریں کلام اور بہت عبادت گذار خلیفہ تھا، اور خاص و عام (باقی ص ۲۰۷ پر)

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آ گیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سنجر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کر دے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستہ میں قتل کر دیا"۔

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک و سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں' اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے' وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں' اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے' اور اسی سوز دروں نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی ص ۲۰۶ کا) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی' ۴۵ سال ۳ ماہ کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ سال اور ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۵)

کے ساتھ وعظ وارشاد، دعوت وتربیت، اصلاح نفوس اور تزکیۂ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حبِ دنیا کی تحقیر وتذلیل، ایمانی شعور کے احیا، عقیدۂ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ وخطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گرماتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نائبین اور عارفین کاملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات وضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے حاضرین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کا مرہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات وشبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت وعظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور "صدیقین" کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع وضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کا درجہ دے دیا گیا

تھا، اور قضا وقدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب داب دل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری، بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر وپیکان، نیزہ وکمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹالے اور اس سے خوف وامید ترک کر دے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید وبیم رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک دیوانہ، چوپایہ، اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب وترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے"[1]

ایک دوسری مجلس میں توحید واخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

"اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سڑاہند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار، رفیقان گمراہ، وگمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک

[1] رموز الغیب ترجمہ فتوح الغیب مقالہ (۱۷) ص ۴۹

رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے' اور بنانے والا ہے' اول ہے' آخر ہے' ظاہر ہے' باطن ہے' دلوں کی محبت روحوں کا اطمینان' گرانیوں سے سبکدوشی' بخشش واحسان' ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے' اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے"۔[1]

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف بیان فرماتے ہیں:۔

"ساری مخلوق عاجز ہے' نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے' نہ نقصان' بس حق تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں کرا دیتا ہے' اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے' جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے' اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں' وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں' بعض ان میں سے ایسے ہیں' جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں' گو دولت مند ہیں' مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا' یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں' جو شخص اس پر قادر ہوا' اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی' وہی بہادر پہلوان ہے' بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا' اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا' اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے' شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے' اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں"۔[2]

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر' مخلوق پر' اپنے دیناروں پر' اپنے درہموں پر' اپنی خرید و فروخت پر' اور اپنے شہر کے حاکم پر' ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے' وہ تیرا معبود ہے' اور ہر وہ شخص

[1] رموز الغیب مقالہ (۶۲) ص۱۵۱ [2] فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی' مجلس ۱۳ ص۸۹

جس سے تو خوف کرے' یا توقع رکھے' وہ تیرا معبود ہے' اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے' اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے' تو وہ تیرا معبود ہے"۔[1]

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت' شرکا سے نفرت' اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

"تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے' میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی' اور رخنہ پڑ جاتا ہے' یا تو جدائی ہو جاتی ہے' یا وہ مر جاتا ہے یا رنجش ہو جاتی ہے اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے' اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے' تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب' اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے' اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے' اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے' اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا' اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو' کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ "وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے' اور وہ اسے" اور یہ ارشاد کہ "میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں" کیا تم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ "خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے' تو اسے مبتلا کرتا ہے پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے" عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا "اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا" اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی' اور خدا سے جو محبت اسے ہے' متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی' اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا' وہ غیور ہے' اور ہر چیز پر غالب و زبردست' تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے' تا کہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کر لے' خاص اپنے لئے بغیر شریک کے' اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ "وہ ان لوگوں کو

[1] فیوض یزدانی مجلس ۲۰ ۔ ص۱۳۷

دوست رکھتا ہے' اور وہ لوگ ایسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل وعیال' دولت ولذت اور خواہشیں ہیں' نیز ولایت وریاست' کرامات و حالات' منازل ومقالات' جنتوں اور درجات اور قرب ونزدیکی کی طلب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی' اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی' کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے' جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے' خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے' تب اس کے دل کے گرد عظمت وجبروت وہیبت کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں' اور اس کے گرداگرد کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا' اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل وعیال واصحاب اور کرامات وحکم وبیانات کچھ مضر نہیں ہوتے' کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں' تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا' بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف وکرامت ورزق ونعمت کے ہوتی ہیں' اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں' انھیں نفع پہونچانے کے لئے۔"[1]

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال واخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا' اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست' دنیاوی ترقیات سے محروم' بے بضاعت وتہی دست' لیکن اعمال واخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات وترقیات سے بہرہ مند تھا' وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا' اور اپنے کو کسی وقت محروم ونامراد سمجھنے لگتا تھا' حضرت شیخ اس شکستہ دل

[1] رموز الغیب مقالہ (۳۲) ص ۸۶-۸۴

طبقہ کی دلجوئی فرماتے ہیں' اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں' ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"اے خالی ہاتھ فقیر' اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے' اے گمنام' اے بھوکے پیاسے ننگے' جگر جھلسے ہوئے' اے ہر مسجد وخرابات سے نکالے ہوئے' اے ہر در سے پھٹکارے ہوئے' اے وہ کہ ہر مراد سے محروم' خاک پر پڑا ہے' اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں کے) پشتے لگے ہیں' مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا' دنیا کو مجھ سے پھیر دیا' مجھے پامال کر دیا' چھوڑ دیا' مجھ سے دشمنی کی' مجھے پریشان کیا' اور جمعیتِ (خاطر) نہ بخشی' مجھے ذلیل کیا' اور دنیا سے میری کفایت نہ کی' مجھے گمنام کیا' اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا' اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں' جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں' اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی' حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے' اور میں بھی' اور ایک ماں باپ آدم وحوا کی اولاد میں دونوں ہیں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت مٹیار زمین (کے مثل) بے ریت ہے' اور رحمتِ حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں' از قسم صبر ورضا و یقین موافقت وعلم اور ایمان وتوحید کے انوار تیرے گرداگرد ہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیخ اپنی جگہ پر مضبوط ہے' کلّے دے رہا ہے' پھل رہا ہے' بڑھ رہا ہے' شاخیں پھیلا رہا ہے' سایہ دے رہا ہے' بلند ہو رہا ہے' روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے' اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں' اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے' اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے' اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں گزریں' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے اس کام کے بدلے میں جو وہ کرتے رہے ہیں' یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جیسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیاوی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ رتیلی اور پتھریلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے، جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو، اور وہ کھاد دینا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درختِ ایمان اور نہالِ اعمال کی جو اس زمین میں اگے ہیں، حفاظت ہو، اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دولتمند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے، اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی، اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے، جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں، اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں، تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین، علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہو جانے کی نہ پرواہ ہے گی۔[1]

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرتِ شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر ضرورت

[1] رموز الغیب مقالہ (۲۵) ص ۶۴-۶۵

انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی "انّ الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاٰخرۃ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں، ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو، اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کو ذلیل کرتی ہے، کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تونگری کے قدم پر۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:۔

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے۔"[2]

خلفا اور حکامِ وقت پر تنقید

حضرتِ شیخ صرف مواعظ، پند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفۂ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

[1] فیوض یزدانی، مجلس ۲۱ ص ۱۳۵ [2] ایضاً - مجلس ۵۱ ص ۳۶۳

كان يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر	آپ خلفاء، وزراء، سلاطین، قضاۃ، خواص و عوام
للخلفاء والوزراء والسلاطين والقضاة	سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے، اور بڑی
والخاصة والعامة يصدعهم بذلك	صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
على رؤس الاشهاد ورؤس المنابر وفي	برسر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم کو حاکم
المحافل وينكر على من يولي الظلمة	بناتا، اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملہ میں
ولا تأخذه في الله لومة لائم۔[1]	کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب "قلائد الجواہر" لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفا یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المظفر کو قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

وليت على المسلمين اظلم الظالمين	تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو
ما جوابك غدا عند رب العالمين	اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے دن تم اس رب
ارحم الراحمين۔	العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے؟

مؤرخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ براندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔[2]

حضرت شیخ ان "درباری سرکاری" علماء اور مشائخ کی بھی پر زور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے جنھوں نے سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی، اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا، جن کی وجہ سے ان سلاطین و حکام کو زیادہ جرأت اور بے خوفی پیدا ہو گئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

"اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت، اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مبتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے علماء

[1] قلائد الجواہر ص۸ [2] ایضاً

اور اے زاہدو! شاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان سے دنیا کا زر و مال اور اس کی شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں، بار الٰہا! منافقوں کی شوکت توڑ دے، اور ان کو ذلیل فرما یا ان کو توبہ کی توفیق دے، اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے یا ان کی اصلاح فرما۔[1]

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کر دیا تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار رہے گا جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں۔[2]

دین کے لئے دلسوزی اور فکرمندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا) دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حمیت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہیں، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دیں، اور جو ڈھے گیا ہے اس کو درست

[1] فیوض یزدانی مجلس ۱۵ ص۳۶۳ [2] ایضاً ۔ مجلس ۵۲ ص۳۷۱

کردیں' یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی' سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے' اے سورج، اے چاند' اور اے دن تم سب آؤ۔[1]

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:۔

"اسلام رو رہا ہے' اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں' گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں' اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو اُن میں موجود نہیں ہیں' اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے' اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کرو کہ امر و نہی بھی کرتے تھے' اور کھاتے پیتے بھی تھے' (اور دفعۃً انتقال پا کر ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے' تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کرنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے' اور اسے دیکھ کر (خوشی کے مارے) کھلاریاں کرتا ہے' حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دو نوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے' اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے' مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو مقصود ہے' نہ تو اس کو پورا کرتا ہے' اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا ہے' اور اس کی حدودِ شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔"[2]

بیعت و تربیت

ان پر تاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا، اور ہزارہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی لیکن زندگی کے گہرے تغیرات' ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحبِ دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی ضرورت تھی' مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں' جہاں

[1] ملفوظات ص۶۴۹ (فیوض یزدانی) [2] ایضاً ص۶۶۱ (فیوض یزدانی)

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے' ان مجالس کے شرکا و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں' پھر کبھی نہ آئیں' یا ہمیشہ آتے رہیں' لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں' اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شگاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جا سکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی' پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے' دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے' اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسردہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو' اور اس کے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو' اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو' اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے' ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبیؐ کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی' بقول سیدنا عمر ابن عبد العزیزؒ وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا' جبایت (تحصیل وصول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی' بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی' دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان' توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور سیاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کر سکتی تھی' اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی' نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل' اور اتباعِ شریعت کے لئے بیعت لے' اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں، اور پھر وہ نائب پیغمبر ان کی دینی نگرانی، اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت، اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت گرمیٔ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنت، اور شوقِ آخرت پیدا کردے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے، پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب و اخلاص، اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء و تجدیدِ دین اور اصلاحِ مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگانِ خدا کو "حقیقتِ ایمان اور درجۂ احسان" تک پہونچا دیا ہے، اس سلسلۂ زریں کے سرِ حلقہ اور گلِ سرسبد حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کا نام اور کام اس "طبِ نبوی" کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے، اور ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلآویز شخصیت، خداداد روحانی کمالات، فطری علو استعداد، اور ملکۂ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر ہے، آپ سے پہلے وہ اتنا مدوّن و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا، نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفا اور باعظمت اہلِ سلسلہ نے تمام ممالکِ اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت، اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جاوہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے برِّ اعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیلِ ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبولِ اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وارضاہ وجزاہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پر اثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی تائیدِ الٰہی آپ کی ذات، آپ کے کمالات، آپ کی تاثیر، اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار، اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیبِ نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت ہے اور اس کا خزانۂ عامرہ کبھی جواہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کرکے ۵۶۱ھ میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی،
صاحبزادہ حضرت شرف الدین علیسیؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں:۔

"جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپکے صاحبزادہ شیخ عبدالوہابؒ نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمایئے کہ آپکے بعد اس پر عمل کروں، فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہو، اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو، اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کردو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو، اور سب کچھ اسی سے مانگو، خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو، توحید اختیار کرو کہ توحید پر سب کا اجماع ہے، اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہوجاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹتی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے، اور فرمایا میں مغز بے پوست ہوں، اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں، میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں، ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو، یہاں بڑی رحمت نازل ہے، ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ باربار فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں، اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے، اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے، بسم اللہ! آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے، اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارے کارساز نے تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے، اور اس دن جس کی شب کو آپنے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی، اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبدالرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ باربار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے، اور فرماتے تھے، تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طرف رجوع کرو، اور صف میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امر حق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور آپنے فرمایا، میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مجھے کسی پر قیاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیزؒ نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الٰہی میں پلٹے کھا رہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیزؒ نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے، اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے، اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہوجاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبارؒ نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے، میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے، اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی، اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلے اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تعزز" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا، تب آپ باربار اسے دہراتے تھے، یہاں تک کہ آپنے آواز بلند اور سخت کرکے لفظ "تعزز" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہوگئی، اور زبان تالو سے چپک گئی، اور روح مبارک رخصت ہوگئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ"[1]

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوس و اخلاق کے مربیوں

لے الکلا رموز الغیب ص۱۸۹-۱۹۲

کی ایک جماعت چھوڑ گئے، جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور بڑھتی ہوئی مادیت اور غفلت کا مقابلہ کرتے رہے۔[1]

---

[1] حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و مصلحین نے دعوت و تذکیر اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور عمومیت سے جاری رکھا، اور غفلت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بغداد شیخ ابوالنجیب سہروردی کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ الشیوخ ابوحفص شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۳۹ھ-۶۳۲ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے، جو طریقۂ سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب "عوارف المعارف" کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں "لم یکن فی آخر عمرہ فی عصرہ مثله وکان شیخ الشیوخ ببغداد" (اخیر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی، اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے[1]) ابن النجار کہتے ہیں "انتهت الیه الریاسة فی تربیة المریدین ودعاء الخلق الی الله" (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلائق تھے[2]) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور استفادہ کرتے رہتے تھے،[3] شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں "وکان له مجلس وعظ وعلی وعظه قبول کثیر وله نفس مبارك" وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انفاس متبرکہ سے لوگوں کو بڑا نفع تھا۔)

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب "عوارف المعارف" کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔[4]

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدینؒ کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد خلفاء عطا فرمائے جنھوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی الحاشیہ) [1] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ (النہضۃ المصریہ) [2] مرآۃ الجنان للیافعی ج ۴ ص ۸۱ [3] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۱۲۰ [4] نواب صدیق حسن خان مرحوم لکھتے ہیں "در تصوف سنی کتابے بہتر از عوارف نیست" "تقصار جیود الاحرار" ص ۶۳

علامہ ابن جوزیؒ

عبدالرحمٰن ابن جوزی، دعوت و اصلاح کا ایک دوسرا نمونہ ہیں، وہ اپنے زمانہ کے یکتائے روزگار مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں، اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیفات اور علمی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

۵۱۰ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۹ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سنی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے کے بجائے محدث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لیتا، دوسرے لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی احسان مندی سے بچایا۔"[1]

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور بُرادہ سے گرم کیا جائے، جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں جمع ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ بچ رہا۔[2]

ذوقِ مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالامال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے، اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، "صید الخاطر" میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:۔

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا، اگر میں کہوں کہ میں نے بیس ہزار

[1] لفتۃ الکبد فی نصیحۃ الولد صـ ۸۱، ۸۲ [2] ابن خلکان ج ۳ صـ ۳۲۱

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علوم نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطح پست معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبۂ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔"[1]

تصنیف و تالیف اور تبحر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نوعمری ہی سے متوجہ ہوئے، روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں تو ہزار تک پہونچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشاء و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوقِ عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ، اور ذوقِ عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابوالمظفر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر یہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو اذواقِ صحیحہ حاصل تھے، اور حلاوتِ مناجات و لذتِ دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے، اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشم بینا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیتِ خاطر اور تعلق

[1] صید الخاطر ج ۳ صـ ۲۰۶-۲۰۷

مع اللہ کو سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے، اور اس میں کمی آنے سے بےچین و مضطرب ہو جاتے تھے، "صید الخاطر" میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ابتدائے عمر ہی سے میرے اندر طریق زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، روزے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی، اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سریع الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور اُنس اور دعا میں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہلِ کارانِ سلطنت میری حسن تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے، اور انھوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا، میں (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بُری نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے مباحات میں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی جتنا میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بجھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورتِ حال سے میری طبیعت میں ایک بےچینی پیدا ہوئی، اس بےچینی کا اثر مجلس وعظ کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی بےچین اور متاثر ہونے لگے اس بےچینی کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بدقسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صالحین کی قبور کی زیارت کی، اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا، جس سے

مجھے وحشت تھی، اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا، اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خوابِ غفلت سے بیدار ہوا، اور میں نے اپنے مہربان و شفیق آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا۔"[1]

ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا، دولتِ عافیت اور دولتِ جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موفق عبد اللطیف کہتے ہیں، کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدبیثی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موزوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فراخ دست اور باحرمت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں معین ہیں، "صید الخاطر" میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بدپرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، "تلبیس ابلیس" میں زہد کے مبالغہ آمیز اور متشددانہ عجمی رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی، اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور حوصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے پست اور محدود نظر آئی ہے، "صید الخاطر" میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں۔

"انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

[1] صید الخاطر ج ۱ ص ۱۲۲-۱۲۱

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے، پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں، تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے، مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے، اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ نہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی، اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے، اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صنف اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پرواہ نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے کہ "ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے" لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطمح نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتا نہ تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند، نفس بلندیوں کا حریص، اس سب کے ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ یہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے، کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور دے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام لوں گا، اس لئے کہ گمنامی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب خوردہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب سے اہم مسئلہ ہی کی بیخ کنی کر دی، اور وہ مسئلہ آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دیوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگان خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیاوی لذتوں کا ایک قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا، اور (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بُری حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح متنبی نے اپنی بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا ترانہ گایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے یقین ہے کہ پہونچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ موضوع ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقیہ حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا عمل ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرخی کا زہد جمع ہو جائے، پھر یہ بات تصانیف کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگان خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، درآنحالیکہ علم کے ساتھ اشتغال کسب معاش سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے سلوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ تصانیف کا بھی شوق ہے تاکہ یہ سب میری یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طیبات و

مستحسنات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدِ راہ ہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر رخصت، اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں، جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں، اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن مال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں، جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آنچ نہ آئے، اور وہ بالکل محفوظ ہو اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری، عزیمت، احتیاط و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تاسف و رنج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت مالایموت کا انتظام کیا جائے تو زہد و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی برضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعثِ تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سانس بھی کسی لایعنی کام میں صرف ہو، اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیۃ المؤمن خیر من عملہ۔"[1]

مجالسِ وعظ اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالسِ درس ہیں، ان مجالسِ وعظ

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۳۴-۳۳۷

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفا، و سلاطین، وزرا، اور اکابر علما ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے ہیں، دس پندرہ ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے[1] تاثیر کا یہ عالم تھا، کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد و شوق میں گریباں پھاڑتے، لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس[2] ہزار یہودی، عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی۔[2]

ابن جوزی نے اپنی مجالسِ وعظ میں بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی، عقائدِ صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواعظ و درس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، اور خلیفۂ وقت اور امرا بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں مسلکِ سلف اور طریقۂ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کی، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

"کتاب الموضوعات"

یہ موضوعاتِ حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے، جن سے اس زمانہ کے اہل ہوئی یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

[1] صید الخاطر ج ۱ ص ۲۱ [2] ایضاً

صدہا غلط فہمیوں کا باعث بنتی تھیں، اس طرح انھوں نے اس شاخ پر تیشہ چلایا جس پر اہلِ بدعت نے آشیانہ بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے، اور انھوں نے کہیں کہیں سخت فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

"تلبیس ابلیس"

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے، جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی نمونہ ہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے، اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے، اور اس کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے، اور دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے، اور کن کن راہوں سے اس کے عقائد، اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے، انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور کسی شخص کی رعایت نہیں کی، اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے، اس میں علما و محدثین فقہا و واعظین، ادبا، شعرا، سلاطین و حکام عباد و زہاد، صوفیہ اہلِ دین، اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں، غلط رسوم و عادات مغالطے اور بے اعتدالیاں بیان کی ہیں، یہ کتاب ان کی وسعتِ نظر زندگی سے واقفیت، باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسیات و سیاست کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں، اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں عجلت اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں، بڑے بیش قیمت

اقتباسات، اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علما پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے، اور اس فن میں موشگافیاں کرتے رہتے تھے۔

"ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی غور و فکر میں ہے انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالہ نجاست اور ماء متغیر کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علومِ شریعت سے خارج نہیں، مگر حصولِ مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کرے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو، قاضی شریح کے سو فیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔"[1]

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

---

[1] تلبیس ابلیس ص ۱۱۹، ۱۲۰

"ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پر تکلف عبارت بولتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے، اس زمانہ میں مواعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہِ طور، یوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے، فرائض کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر کبھی نہیں ہوتا، ایسے مواعظ سے ایک زانی، ایک سود خوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے، اور کب عورت کو شوہر کے حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ مواعظ اِن مضامین سے خالی ہوتے ہیں، ان واعظوں نے شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، اسی لئے ان کا بازار خوب گرم ہے، اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے، اور باطل ہلکا اور خوشگوار۔[1]"

آگے لکھتے ہیں :-

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت کر چکی ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا واعظ اس کی قائم مقامی کرے، یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی۔[2]"

یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ :-

"اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں، جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے، اس لئے کہ مخلص علماء اور مدرسین کی مثال اطباء کی سی ہے، جو لوجہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبیب کے ہاتھ سے شفا ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے۔[3]"

حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

[1] تلبیس ابلیس ص ۱۲۵ [2] ایضاً [3] تلبیس ابلیس ص ۱۳۱ (نقد مسالک العلماء الکاملین)۔

"یہ حضرات شریعت کے مقابلہ میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں، کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا جائز نہیں، اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، اس کو تکملہ اور ضمیمہ کی ضرورت ہے، اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں۔ یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے، اس لئے کہ شریعت سیاستِ الٰہی ہے، اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں کوئی خلل یا کمی ہو جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ" (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے کہ "لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ" (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے، وہ دراصل شریعت میں خلل اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے، اور یہ کفر کی بات ہے۔[1]"

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مغالطہ کا ذکر کرتے ہیں :-

"معاصی پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے، اور ان سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا دفعیہ نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس سے گزرا، اس چنگی والے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مرد صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان سے واقعہ بیان کیا، مالک بن دینار چنگی والے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تعظیم کی، اور کہا کہ آپ نے کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوا دیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ چنگی کا ناجائز روپیہ وصول کر کے رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سُن لی جائے گی، اور ہزار کی نہ سُنی جائے گی۔[2]"

[1] نقد مسالک الولاۃ والسلاطین ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۳۴

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ "ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلاف شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اور ان پر وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں، جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بار ہوتا ہے، اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں، اور دوا میں خرچ کرنا انسان کو بڑا بار معلوم ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا، یہ بھی ان کے لئے گویوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمۂ ریاست ہیں۔[1]

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک الدنیا درویشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں، یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکائے اور خشوع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی، اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ، یہ تارک الدنیا وہ طالب دنیا، یہ اچھی غذائیں کھاتا ہے، نہ شادی کرتا ہے حالانکہ محض جہالت ہے، اور شریعت محمدیؐ کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے، پاک و صاف چیزیں کھاتے اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔[2]

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفل خیر میں شرکت اور رقت ہے، اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے، تو یہ سننا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے، میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو

[1] نقد مسالک لولاۃ والسلاطین ص۳۷۳ [2] تلبیس ابلیس علی العوام ص۳۸۹-۳۸۸

جانتا ہوں، جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور روتے ہیں، متاثر ہوتے ہیں لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں، ارکان صلوٰۃ سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے، ویسے ہی اب بھی ہیں، مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے، اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں، شیطان نے ان کو یہ جُل دے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ و بکا اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صالحین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔[1]"

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے، چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کرواتے ہیں، اگر رضائے الٰہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے، ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک دیوار بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔

اسی طرح سے رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بتیاں بھیجتے ہیں، حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے، اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سا تیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔[2]"

"صید الخاطر"

"صید الخاطر" ایک کشکول ہے، جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلمبند کئے ہیں، اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

[1] تلبیس ابلیس علی العوام ص۳۹۳-۳۹۴ [2] تلبیس ابلیس علی اصحاب الاموال ص۳۹۵

اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال وجواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں، اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں، اور مفید ہدایات روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدہا کام کی باتیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادبا و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات، اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، اور یہی ایک عامی اور ایک صاحبِ نظر میں فرق ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جا رہے ہیں، اور دونوں کچھ گا رہے ہیں،... ایک مصرعہ پڑھتا ہے، دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے، تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے، یا اسی طرح کے مصرعہ سے جواب دیتا ہے مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر سستا لیتا ہے، اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں مشغول ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے، اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے، اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستہ کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کیا جائے جیسا کسی شاعر نے کہا ہے کہ "رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں، تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کرو"۔

اسی طرح کی حکایت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنوئیں سے پانی پی لیں، بشر حافی نے کہا کہ اگلے کنوئیں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشر حافی نے آگے کے کنوئیں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو بہلائے گا، اور اس کی دلجوئی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا رہے گا تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگان سلف فرماتے تھے کہ "اے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر" بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھا لے جاتا اور وہ روتا ہوتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہیے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاطفت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے"۔[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں، تو محلہ کے کتے ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم

[1] صید الخاطر ا ص ۴۷-۱۴۶

ہوا کہ شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں' اس لئے کہ مقامی کتے موٹے موٹے بدن اور بھدے اعضا کے ہیں' ان میں امانت کی صفت نہیں' لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں' اور جیسا ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے' اسی طرح ان کے عادات مہذب ہیں' وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ اس کو منھ لگائیں' مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکریہ میں وہ اس شکار کو جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں' اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت ہوتی ہے' اگر وہ لطیف ہے' تو یہ بھی لطیف ہیں' دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا' اسی طرح جس کو اللہ تعالےٰ ایمان و عقل کی دولت سے سرفراز کرے' اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا' جو ایمان و عقل سے محروم ہو' اور وہ اس کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا' اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے' اور یہ دوسرے عالم میں' وہ دنیا کی بنا پر حسد کرتا ہے' اور اس کا مطمحِ نظر آخرت ہے' اور دونوں میں بُعد المشرقین ہے[1]"۔

واقعاتِ زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں' اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ کرتے ہیں' ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صالح بزرگ دعا میں شریک تھے' دعا قبول ہوئی لیکن کس کی دعا قبول ہوئی' اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔

"مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی' میں نے دعا کی' اور اللہ سے سوال کیا' ایک صاحبِ صلاح اور اہلِ خیر بھی میرے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے' میں نے قبولیت کے کچھ آثار دیکھے' میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے' تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں' میں نے کہا کہ

[1] صید الخاطر ج ۳ صـ ۲۳۹-۴۰

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے' جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا قبول ہو' لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو' اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات سے محفوظ ہے' جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے' لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے' مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر دل شکستگی اور ندامت ہے' اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و سرور ہے' اور کبھی اعترافِ تقصیر ایسی ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے' اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں' وہ یہ کہ ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں' تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدایا مجھے محض اپنے فضل سے عطا فرما' میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی' اور ممکن ہے کہ اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے' اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو اے میرے نفس میرا دل زیادہ نہ توڑ وہ پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے' مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے' جس کا تقاضا ادب اور تواضع ہے' پھر اپنی تقصیروں کا اقرار ہے' جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے' اس کا بے حد محتاج ہوں اور جس سے سوال کیا ہے' اس کے فضل کا یقین ہے' اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے' میرا تو اعترافِ تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے[1]"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا' مجھے کچھ کشمکش درپیش تھی' نفس کچھ تاویلیں سامنے لاتا تھا' اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا' اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں' اور کراہت کی کھلی ہوئی دلیل موجود تھی' میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا' اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمادے اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی' میرے درس کے سلسلہ میں سورۂ یوسف شروع ہو رہی تھی' میں نے

[1] صید الخاطر ج ۱ صـ ۱۵۷-۵۸

وہیں سے شروع کیا، وہ خیال دل پر مستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا جب اس آیت پر پہونچا: "قَالَ مَعَاذَ اللهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ" تو میں چونکا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہا، تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے، وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ نہ وہ غلام تھے، نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ یہ بیان کی کہ "اَحْسَنَ مَثْوَایَ" مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کر، تو حقیقۃً غلام ہے ایسے آقا کا جو تیرے وجود کے وقت سے برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا، اور اتنے بار اس نے تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس نے کس طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے روزی دی، تیری حفاظت کی، خیر کے اسباب مہیا کئے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر مکر و دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہری کے ساتھ باطنی ذکاوت وجودتِ طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے، جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھ تک پہونچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحتِ اعضا کا یا سلامتِ مزاج، یا اعتدالِ ترکیب کا یا لطافتِ طبع اور دناءت و ابتذال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستہ کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جامد سے نجات کا،

یا مبتدع کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللهِ لَا تُحْصُوْهَا" کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچھایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھ کو سبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سربلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شادکام اور فائز المرام ہے اس حالت میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پورا نہ ہونے ہی میں حکمتِ الٰہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں، اور جن کا ذکر میں نے کیا ہے، ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھ کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، "مَعَاذَ اللهِ اِنَّهٗ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسئلہ پر عمل کیا، جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندۂ درگاہ اور معتوب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی، میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرۂ فقہاء سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اوّل تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۸۵-۲۸۳

فتویٰ لیا جاتا تو وہ اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کرتا کیوں؟ میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لیے بھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر یہ اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہرحال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے، میں نے کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کرے اور فرض کرے کہ تو نے جس کو ترک کیا ہے، وہ بالاجماع جائز ہے، تب بھی بربنائے ورع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر، چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔"[1]

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، "تلبیس ابلیس" اور "صید الخاطر" دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں، اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، "صید الخاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ سودمند نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مؤثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے اس لئے کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا، بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۰۴

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبۂ فن حدیث کی ساری توجہ اونچی سند حدیث اور کثرت مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام تر توجہ جدلیات اور حریف کو زیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صالحین اور زہادِ امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔"[1]

صلحاء امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صالحین اور صلحائے امت میں سے بہت سے متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سیدنا عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخی،[2] ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ "صفۃ الصفوۃ" لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب "حلیۃ الاولیاء" کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ مؤثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فنِ تاریخ کی اہمیت و ضرورت

[1] صید الخاطر ج ۲ ص ۳۰۲-۳۰۳ [2] اپنی اس مستقل تالیفات کا تذکرہ انھوں نے خود "صید الخاطر" میں کیا ہے ج ۱ ص ۱۳۷، ص ۱۵۴ و ص ۱۷۵، ج ۲ ص ۳۶۳، ج ۲ ص ۳۶۳، ج ۳ ص ۵۶۳، ص ۶۰۴ اور ص ۶۰۶ ان میں سے دو اول الذکر چھپ چکی ہیں۔

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں، ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگذاشتیں ہوئی ہیں، جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایانِ شان نہیں، اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو، اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی خفت کا باعث ہو "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں:-

"فقیہ کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو، تاریخ ہو یا حدیث، لغت ہو یا دوسرا فن اس لئے کہ فقہ تمام علوم کا محتاج ہے، اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلیؒ اور قاضی شریک ایک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم! ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؓ اور سیدہ فاطمہؓ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی، اس لئے حضرت علیؓ نے سیدہ کو غسل دیا، میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے، پھر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے بعد ان کی بھانجی امامہ بنت زینبؓ سے نکاح کیسے کیا، اسی طرح میں نے امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں ایسی تاریخی فروگذاشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انھوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا، میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، اسی طرح انھوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے، جس کو انھوں نے مستظہر باللہ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبد الملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبرکاً بھیجو، انھوں نے ان کے پاس اُبلا ہوا چوکر بھیجا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا، پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا، اور اس سے عبد العزیز پیدا ہوئے، عبد العزیز کے عمر بن عبد العزیز پیدا ہوئے، یہ سخت مغالطہ ہے، اس لئے کہ انھوں نے عمر ابن عبد العزیز کو سلیمان بن عبد الملک کا پوتا قرار دیا، حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے، شیخ ابو المعالی جوینی نے اپنی کتاب "الشامل" کے آخر میں جو اصول فقہ

میں ہے، لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقل ہے کہ حلاج، جنابی قرمطی، اور ابن المقنع نے سلطنتوں کے نظام کے الٹنے، مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی، اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لے لی، جنابی نے احساء میں سکونت اختیار کی، ابن المقنع ترکستان کے حدود میں جا بسا، اور حلاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا، اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا، اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا، اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور ذہین ہیں اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقل کو یہ معلوم ہوتا کہ حلاج نے ابن المقنع کا زمانہ ہی نہیں پایا، اس لئے کہ ابن المقنع کے قتل کا منصور نے حکم دیا تھا، اور یہ ۱۴۴ھ کا واقعہ ہے، درانحالیکہ ابو سعید الجنابی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا ہے، اور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، اس بنا پر قرمطی اور حلاج کا زمانہ قریب قریب ہے، لیکن ابن المقنع بہت متقدم ہے، اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے، اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو، اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے، ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی معیوب ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے، اس لئے کہ وہ طُرق حدیث کے جمع کرنے میں مشغول ہے، اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوئی، اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے، اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے، جو پست اور بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے"[1]

تاریخی تصنیفات

انھوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک مبسوط کتاب "المنتظم فی تاریخ الملوک والامم"

[1] صید الخاطر ج ۳ ص ۶۰۴-۶۰۶

لکھی جو دس جلدوں میں ہے، اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر ۵۷۴ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، مصنف پہلے سن لکھتے ہیں، پھر اس سن کے اہم واقعات وحالات کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر اس سن میں جن ممتاز اور قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے، ان کے حالات بیان کرتے ہیں، اس طرح یہ کتاب حالات وتذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔[1]

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب "تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر" ہے، جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔[2]

ادبیت وخطابت

ابن جوزی کی فصاحت وبلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی مجالس وعظ کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا بھی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑ دیں، اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں، یہ سب تکلف اور تصنع ہے، لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خدا داد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب، اس لئے ان کو دعوت وتبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار بشدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت وتبلیغ کو چھوڑ کر زہد وانقطاع کی زندگی اختیار کرلیں، اور لوگوں سے بالکل یکسو ہو کر گوشہ نشیں ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل وبراہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ ومناظرہ کر کے اس خیال کو

[1] اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ [2] یہ کتاب ہندوستان میں مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

ہٹایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ القاء شیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے ہاں سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت وتبلیغ کا تھا، اور ان کی زندگی اجتماع واختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطل کو پسند کرتا ہے، اور جد وجہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے، اس لئے کہ عزلت وگوشہ نشینی اور زہد وانقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادۂ عوام اور عمومی دعوت کے دائرہ سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پورے انہماک وقوت کے ساتھ اصلاح وافادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۵۹۷ھ میں شب جمعہ کو اس داعی الی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے، جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور ناکافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔

نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے، اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکزِ اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور بعض عظیم شخصیتیں اصلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے، اور مسلمانوں کی ہستی اور نفس اسلام کا وجود زد میں تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے، اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، یورپ کے اشتعال اور جذبۂ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقتور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پران کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب سے اس کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے، سلجوقی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا، جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوائیوں سے آگ لگا دی، اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع و زرخیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب و محرکات جمع ہو گئے جنھوں نے صلیبی حملوں میں دینی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔[1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" ج ۶، مضمون (CRUSADES)

بہر حال ۴۹۰ھ میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الرہا (ایڈیسا) اور ولایتِ انطاکیہ کے بڑے شہروں، بہت سے قلعوں اور حلب پر قبضہ کر لیا، ۴۹۲ھ مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی مبارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آ گیا، مشہور انگریز مورخ سٹینلے لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلۂ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورّخ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے، کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (معبد) میں زندہ جلا دیئے گئے۔"

"دوسرے دن اس سے بڑے پیمانہ پر ان لرزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹینکرڈ نے تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ چیختا چلاتا رہا، اور ان سب کو باہر لا کر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیئے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر لگے تھے، بالآخر یہ سفاکانہ قتل عام اختتام کو پہنچا شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوایا گیا۔"[1]

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ ص ۶۲۷ مضمون "CRUSADES"

اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، شام و فلسطین میں مستقل چار عیسائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے حوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ رنجی نالڈ وائی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا[1]، اور روضۂ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور اہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھڑی نہیں آئی، یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بدنظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو، اور جو عالم اسلام کی بچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، سٹینلے لین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر ہر شخص پر تحیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بدنظمی کا تھا جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر یکجہت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں[2]۔"

اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارا طلوع

۱؎ سلطان صلاح الدین ایوبی از (اسٹینلے لین پول) ص۱۸۸ ۲؎ ایضاً ص۲۱

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔

لین پول لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں، اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دلیری اور ہمت اور جنگی قابلیت کا سکہ سب ماننے لگیں، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جوانمرد اور جنگجو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا[1]۔"

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردۂ نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق (اتابک) اور سلطان کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (اڈیسا) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۶ جمادی الاخریٰ ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۴ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب مورخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتدا کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نورالدین زنگی نے بہت آگے تک پہونچا دیا۔

الملک العادل نورالدین زنگی

نورالدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس[1]

۱؎ سلطان صلاح الدین ص۲۹

کے بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حملوں سے تمام مسیحی ریاستوں پر دھاک بٹھادی تھی ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس مع دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہوگئے، اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قید، اس قبضہ کے بعد ہی قلعہ بانیاس فتح کیا[1]، ادھر اس نے مصر فتح کرکے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کرلیا، الین پول لکھتا ہے:-

"نورالدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا رودنیل پر قابض ہوجانا یہ معنی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آگئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دمیاط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہوجانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہوگیا، اور انہوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کردیا"[2]۔

نورالدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کردیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نورالدین کے حسنات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۴ء کو چھپن ۵۶ برس کی عمر میں بعارضہ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ "سلطان نورالدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے"[3]۔

نورالدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نورالدین کے عدل، دیانت و تقوی، حسن انتظام، شرافت نفس، محامد اخلاق

[1] الکامل (ابن اثیر) جلد ۱۱ ص ۱۲۴ [2] سلطان صلاح الدین ص ۸۹ [3] ایضاً ص ۱۱۵

اور جذبہ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا "ممدوح" و "محمود" ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں:-

جاهد الثغور وانتزع من ايدى الكفار نيفا وخمسين مدينة، وكانت سيرته اصلح من كثير من الولاة والطرق فى ايامه آمنة والمحامد له كثيرة وكان يتدين بطاعة الخلافة وترك المكوس قبل موته وكان يميل الى التواضع ومحبة العلماء واهل الدين[1]۔

نورالدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ سے کچھ اوپر پچاس شہر آزاد کئے، ان کی زندگی اکثر سلاطین و حکام سے بہتر تھی راستے محفوظ تھے، ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں، وہ خلافت بغداد کی ماتحتی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے انتقال سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کردیئے طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی، اور علماء و اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاط، جچے تلے الفاظ اور نپی تلی تعریف میں مشہور ہیں، لکھتے ہیں:-

وكان ملكا عادلا زاهدا عابدا ورعا متمسكا بالشريعة مائلا الى الخير مجاهدا فى سبيل الله تعالى كثير الصدقات بنى المدارس بجميع بلاد الشام الكبار وله من المناقب والمآثر والمفاخر مايستغرق الوصف[2]۔

وہ ایک منصف، زاہد، عابد، متقی، متبع شریعت سلطان تھے، اہل خیر کی طرف بڑا میلان رکھتے تھے اور جہاد فی سبیل اللہ کا خاص اہتمام تھا کثرت سے صدقات و خیرات کرتے، شام کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مدارس تعمیر کئے، ان کے مناقب یادگاروں، اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔

تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر جزری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ:-

[1] المنتظم ج ۱۰ ص ۲۴۸-۲۴۹ [2] ابن خلکان "محمود نورالدین زنگی" ج ۴ ص ۲۷۲

وقد طالعت سیر الملوک المتقدمین	میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا
فلم ار فیھا بعد الخلفاء الراشدین و عمر	مطالعہ کیا ہے، خلفاء راشدین اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ
بن عبد العزیز احسن من سیرۃ ولا اکثر	کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ
تحریًا منہ للعدل[1]	عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ صرف اپنی اس جائداد کی آمدنی سے کھاتے پہنتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو فروخت کرکے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں خرچ کے لئے دے دیں، جو حمص میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس[2] دینار کے قریب تھی، جب بیوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ تم میرے پاس دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں.... اس امانت میں خیانت کرکے تمہاری خاطر جہنم میں جانا گوارا نہیں کرسکتا۔

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی نیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی، مصر و شام، جزیرہ، موصل سب جگہ اس کو موقوف کردیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہوگئے، اور قاضی صاحب کو کہلا بھیجا کہ میں عدالت میں حاضر ہورہا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدمہ میں ان کو کامیابی

[1] الکامل ج ۹ ص ۱۶۳

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کردیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضر نہ ہونے کا سبب میرا تکبر ہو، اس لئے میں حاضر ہوگیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دار العدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی، وہ جنگ میں دو کمانیں اور دو ترکش ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے، مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ معبود برحق ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہوجاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس تواضع و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و داب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کی یہ کتاب متحمل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے۔"[1]

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۸ھ میں نور الدین کو حصن الاکراد کے معرکہ میں (جو بقیعہ کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کردینے کی وجہ سے شکست ہوئی،[2] نور الدین حمص کے قریب دشمن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

[1] الکامل ج ۱۱ ص ۶۴-۱۶۳ [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الکامل ج ۱۱ ص ۱۱۹۔

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا، فتحیاب دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پروا نہیں، خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہلِ لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقہا، فقرا اور صوفیہ و قرا کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں، ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرتِ الٰہی کی امید انہی فقرا و ضعفا کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کردوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں، اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانحالیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں جب مجھے دیکھتے ہیں، اور ان کے تیر کبھی خطا کر جاتے ہیں کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں[1]"۔

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی، لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امرا و حکام کو پر اثر خطوط لکھے، اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلحا و فقرا کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی، اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رو رو کر لوگوں کو یہ خطوط پڑھ کر سنائے، اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوشِ جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، والیانِ ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں لیکن

لہ الکامل ج ۱۱ ص ۱۱۹

سلطان نے اپنی نذر پوری کی، اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔[1]

نورالدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاس کے محاصرہ میں اس کے بھائی نصرۃ الدین امیر امیران کی ایک آنکھ جاتی رہی، نورالدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آ جائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے تو تم کو تمنا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آ جائے۔[2]

سلطان صلاح الدین ایوبی[3]

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشو و نما[4] ہوا، مصر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد نوجوان

لہ الکامل ج ۱۱ ص ۱۲۲، ۱۲۳ ۲ہ ایضاً ص ۱۲۳ ۳ہ سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابوایوب انصاری سے ہے، سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلاً کرد ہے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

۴ہ ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ "ہذانیہ" کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شادی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیرکوہ اسدالدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے تھے، اس کے بعد تکریت میں سکونت پذیر ہوئے، اور وہیں شادی کا انتقال ہوا، کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہدالدین بہروز کوتوال شہر کے عملے میں داخل ہو گئے، جو سلطان مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عمادالدین زنگی سے متعلق ہو گئے، اور قلعہ "بعلبک" وغیرہ کے محافظ بنا دیئے گئے، (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید ابوجدید ص ۶۱، ۶۲)

بیت المقدس کا فاتح اور عالمِ اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفا اور صلحا کے لئے قابلِ رشک ہے، اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا، جس سے روحِ مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ "بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے، وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پُرامن نیکی کی بنا رہا، جو شریف طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے"[1]۔

لیکن جب اللہ تعالٰے کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے ولی نعمت نورالدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہاءالدین ابن شدّاد سلطان کے معتمدِ خاص لکھتے ہیں کہ "سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا، بالکل میری مرضی سے نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے" وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ[2]۔

زندگی میں تبدیلی

مصر پہونچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہوگیا، اور مصر کی زمامِ مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالٰے کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاءالدین ابن شدّاد لکھتے ہیں کہ "حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہوگئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب سے توبہ کی، عیش و تفریحات سے منہ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی"[3]۔

---

[1] سلطان صلاح الدین ص۶۳ [2] النوادر السلطانیہ ص۳۱ [3] ایضاً والمحاسن الیوسفیہ ص۳۲، ۳۳

لین پول بھی یہی لکھتا ہے :-

"اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیئے متقی اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر اب ان میں اور سختی اختیار کی، دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود ایک مثال بنا، اس نے اپنی تمام بلیغ کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت قائم کرے جس میں کہ کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا "جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دینا منظور ہے"۔

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر عمر تک اسلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا"[1]۔

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذتِ عیش، اور اس کی روح کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ :-

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا، یہی ان کا موضوعِ گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اسباب و وسائل پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انہوں نے اپنی اولاد اور اہلِ خاندان اور وطن و

---

[1] سلطان صلاح الدین ص۸۶

مسکن اور تمام ملک کو خیرباد کہا اور سب کی مفارقت گوارا کی اور ایک خیمہ کی زندگی پر قناعت کی جس کو ہوائیں ہلا سکتی تھیں، کسی شخص کو اگر ان کا قُرب حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتا، (اور اس طرح ان کی نظر میں وقعت حاصل کر لیتا) قسم کھائی جا سکتی ہے کہ جہاد کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد انھوں نے ایک پیسہ بھی جہاد اور مجاہدین کی امداد و اعانت کے علاوہ کسی مصرف میں خرچ نہیں کیا۔"[1]

سلطان کی اس عاشقانہ کیفیت اور دردمندی کی تصویر ابن شداد نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:۔

"میدانِ جنگ میں سلطان کی کیفیت ایک ایسی غمزدہ ماں کی سی ہوتی تھی، جس نے اپنے اکلوتے بچہ کا داغ اٹھایا ہے، وہ ایک صف سے دوسری صف تک گھوڑے پر دوڑتے پھرتے، اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے خود ساری فوج میں گشت کرتے اور پکارتے پھرتے "یا للاسلام" اسلام کی مدد کرو! آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے۔"[2]

عکا کے معرکہ میں ان کی کیفیت یہ تھی:۔

"سارے دن سلطان نے ایک دانہ منھ میں نہیں رکھا، صرف طبیب کے مشورہ اور اصرار سے ایک مشروب کا استعمال کیا۔"[3]

شاہی طبیب نے مجھے بتلایا کہ ایک مرتبہ جمعہ سے اتوار تک سلطان نے صرف چند لقمے کھائے، ان کی طبیعت میدانِ جنگ کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہی نہیں تھی۔"[4]

حطین کی فیصلہ کن جنگ

آخر مختلف جنگی کارروائیوں اور مقابلوں کے بعد وہ معرکہ پیش آیا، جو تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، اور جس نے فلسطین کی مسیحی سلطنت کا خاتمہ اور صلیبیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، یہ حطین کی جنگ تھی، جو سنیچر کے دن ۲۴ ربیع الآخر ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء کو پیش آئی،[5] اور جس میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔

لین پول اس میدانِ جنگ کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

[1] النوادر السلطانیہ ص ۱۰ [2] ایضاً ص ۱۵۵ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۹ [5] ۴ جولائی ۱۱۸۷ء۔

"مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب جوانمرد قید کر لئے گئے، گائی بادشاہ یروشلم اور اس کا بھائی جاٹیلون (حنین) کا ریجی نالڈ تینین کا ہمفری طبقات داویہ اور سبیطار کے دونوں مقدم اور بڑے بڑے عیسائی شرفا گرفتار کر لئے گئے...... باقی فلسطین کے تمام عیسائی بہادر اور شہسوار مسلمانوں کے پہرے میں تھے، مسیحی لشکر کے معمولی سپاہی پیدل اور سوار جو زندہ بچے تھے، سب مسلمانوں کے اسیر ہو گئے تھے، ایک ایک مسلمان سپاہی تیس تیس عیسائیوں کو جنھیں خود اس نے گرفتار کیا تھا، خیمے کی رسّی میں باندھے جاتا دیکھا گیا، ٹوٹی ہوئی صلیبوں، اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں میں مردوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے، جیسے پتھر پر پتھر پڑے ہوں، اور کٹے ہوئے سر زمین پر اس طرح بکھرے پڑے تھے، جیسے خربوزوں کے کھیت میں خربوزے پڑے نظر آئیں[1]...... مدتوں تک جنگ کا یہ میدان جس میں یہ خونی لڑائی ہوئی تھی، اور جہاں بیان کیا جاتا تھا کہ تیس ہزار آدمی مارے گئے تھے، مشہور رہا، ایک سال کے بعد سپید سپید ہڈیوں کے تودے اور ڈھیر دور سے لوگوں کو نظر آتے تھے، اور جانوروں کے کھانے کے بعد جو ٹکڑے لاشوں کے بچے تھے، وہ بھی میدان میں جا بجا پڑے دکھائی دیتے تھے۔"[2]

سلطان کی دینی حمیت

اس فتح کے ساتھ یہ واقعہ بھی تاریخ میں یادگار رہے گا، جس سے سلطان کی دینی حمیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا اندازہ ہوتا ہے، مناسب ہے کہ یہ واقعہ بھی ہم انگریز مورخ کی زبان سے سنیں۔

"سلطان صلاح الدین نے اپنا خیمہ لڑائی کے میدان میں نصب کرایا، جب خیمہ نصب ہو گیا، تو حکم دیا کہ قیدی سامنے حاضر کئے جائیں، بادشاہ گائی اور ریجی نالڈ جاٹیلون (حنین) دونوں اندر لائے گئے، سلطان نے بادشاہ یروشلم کو اپنے پہلو میں بٹھایا، اور اُسے پیاسا دیکھ کر برف میں سرد کئے ہوئے پانی کا

[1] سلطان صلاح الدین ص ۱۸۷، ۱۸۸ [2] ایضاً ۱۸۹۔

کٹورادیا، گائی نے پانی پیا، اور پانی کا کٹورا واپس کر کے ریجی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناخوش ہوا اور ترجمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گائی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، اگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین اتنا کہہ کر کھڑا ہوا اور ریجی نالڈ کے سامنے آیا، ریجی نالڈ جب سے خیمہ میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن! میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو[۲] مرتبہ کھائی تھی، ایک[۱] مرتبہ تو اس وقت جب کہ تونے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری[۲] مرتبہ اس وقت جب کہ تونے دھوکے اور دغابازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا،[۱] دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جیسا کہ عہد کیا تھا، ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رمق باقی تھی، اسے پہرے والوں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گائی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا۔"[۲]

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریجی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ "ھا انا انتصر لمحمد علیہ الصلوٰۃ والسلام" (لو میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔[۳]

---

[۱] قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جب ان بیکس حجاج نے اس سے انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ "اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں" یہ فقرہ صلاح الدین کو پہونچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا ص۱۲۷ [۲] سلطان صلاح الدین ص۱۸۵ [۳] النوادر السلطانیہ ص۶۴

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آگیا، جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی، یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

"سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی، اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے متحمل نہیں تھے۔"[۱]

اسی سال ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء ۲۷ رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے، اور ۹۰ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولیت میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی جس تاریخ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:۔

"یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہلِ حرفہ اور اہلِ طرق کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی پیچھے نہیں رہا، ہر طرف دعا، تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹۰ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبۂ صخرہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اللہ تعالٰے کی مدد کھلی آنکھوں نظر آرہی تھی۔"[۲]

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالٰے بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔[۳]

---

[۱] ایضاً ص۲۱۳ [۲] ایضاً ص۶۶ [۳] تاریخ ابی الفداء اسماعیل ج ۳ ص۷۷

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریادلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ عیسائی مورّخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

"صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم وزیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی واقعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ ہر شہر والے کو جو زرِفدیہ ادا کر چکا ہے، باہر جانے دے۔"

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے

"اب صلاح الدین نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کر دیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زرِفدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں، اور یہ سب باب العزر سے نکلنے شروع ہوئے، اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر وخیرات تھی، جو صلاح الدین نے بیشمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔"

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس مغلوب و مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا، جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں، جب گوڈ جے اور ٹنکریڈ یروشلم کے کوچہ و بازار میں سے گذرے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے، جب کہ

بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتلِ عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگایا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جناب مسیح نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے اس وقت وہ اُن کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفاتِ خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفت رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو بازیاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں یکتا، اور بے مثل شخص تھا۔"[1]

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُبل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، اور مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر فریڈرک، رچرڈ شیر دل، شاہان انگلستان، فرانس، صقلیہ آسٹریا

[1] سلطان صلاح الدین ص ۲۰۲، ۲۰۵

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نائٹ اپنی آہن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعزہ اور چند حلیف جو پورے عالمِ اسلام کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے۔

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز و خوں آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس، اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستور ان کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدینؒ کے زیرِ نگیں تھا صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں تکمیل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

"جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے تو صور سے لے کر یافا تک ساحل پر بجز زمین کی ایک تپلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلحنامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی، صلیبیوں نے جو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ افرنجیوں کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان و مال کا لحاظ کیا جائے تو یہ نتیجہ نہایت حقیر تھا، پاپائے روما کی فریاد سنتے ہی کل مسیحی دنیا نے ہتھیار اٹھا لئے تھے، قیصر فریڈرک، شاہانِ انگلستان و فرانس وصقلیہ، آسٹریا، کا لیوپولڈ برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈر کا کاؤنٹ صدہا مشہور و معروف بیرن اور تمام عیسائی قوموں کے نائٹ یروشلم کا عیسائی بادشاہ اور فلسطین کے دیگر عیسائی والیانِ ملک طبقہ داویہ اور طبقہ البیطار کے بڑے بڑے شہسوار اس کوشش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور یروشلم کی مسیحی سلطنت جو مٹنے کے قریب ہے، پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا؟ اسی دوران میں قیصر فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان، فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھارے، اور ان کے بڑے بڑے شریف اور معزز ساتھی ارضِ ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن یروشلم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحلِ عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔

تیسری جنگ صلیب میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی، مگر کسی کی زبان پر حرف شکایت نہ تھا کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع والیانِ ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی کمک پر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن بہرکیف اپنی اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے، آخری جنگ جو ارسوف پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔....

اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کرد، ترکمان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے، اور طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شیر و شکر بنا رکھا تھا کہ تمام لشکر تنِ واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رکن رہے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود یافا پر فوج کے تمرد کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۲ء کے موسم خریف تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۷ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باج گزار ریاست نے اس سے بغاوت کی، گو جو توقعات ان کی خیر خواہی اور جفاکشی سے رکھی گئی تھیں وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط اعتقاد اور قیادت کی طاقت کو بھی آزمائش میں لاکر ہرا دیتیں، صرف عراق میں سلطان کے ایک عزیز کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً معافی دے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثنا اس اثر کو اور قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا جب جنگ پنج سالہ کی یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہو لیں، تب بھی سلطان کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک بذاتِ واحد حکمران رہا، اور ان حدود سے بھی دور کردستان کا بادشاہ ارمینہ کا کاتلیین (حاکم وقت) قونیہ کا سلطان اور قسطنطنیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے مبارکباد دینے البتہ حاضر ہوئے، یہ کل کشمکش صرف صلاح الدین نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی العادل کے جو آخری زمانہ میں بیّن طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی ایک سپہ سالار یا مشیر کو بتا سکے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا مشیر یا صلاح کار ہو کر اس پر حاوی ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملاتِ جنگ میں مشورہ دیتی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ سلطان کی صحیح رائے پر اس کی غلط رائے غالب آ گئی، جیسا کہ صور اور عکہ کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی، بیٹے، بھتیجے، پرانے رفیق، نئے ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، محتاط اور وفا شعار معتمد وزیر، متعصب واعظ، اور ملا سبھی اس میں متفق الکلام تھے، کہ جہاد کیا جائے اور سب اس میں شریک بھی ہوئے، اور سب نے آقا کی بڑی تندہی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش فکر اور محنت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ سلطان صلاح الدین کا تھا۔[۱]

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲۷ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ستاون سال کی تھی،[۲] قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۲۷ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بارھواں دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی، اور قوت گھٹ گئی شیخ ابو جعفر امام الکلاسہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آ گئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس ہوں اور ان کو تلقین کر سکیں، اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پابرکاب ہیں، شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے "هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ" پڑھی تو سلطان کو ہوش آ گیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، اور چہرہ کھل گیا، اور کہا صحیح ہے، اور یہ کہہ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی، یہ چہار شنبہ کا دن صفر کی ۲۷ تاریخ اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ، شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی برستی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا سناٹا اور کیسی اداسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا فدیہ بن جانے

---

[۱] سلطان صلاح الدین صفحہ ۳۱۲، ۳۱۳ [۲] سلطان کی ولادت ۵۳۲ھ کی ہے، (ابو الفداء ج ۳ صفحہ ۹۰)

کی تمنا کرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں، اور اس کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔"[1]

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک دینار اور ۴۷ درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پولے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات، اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:-

"سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ والجماعۃ کے ہم مسلک و ہم اعتقاد، نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ سالہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے جماعت نہیں پڑھی، حالتِ مرض میں بھی امام کو بلا لیتے، اور بتکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو (شافعیہ کے مسلک کے مطابق[2]) نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیہوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس لئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا، جس پر زکوٰۃ فرض ہو، ان کی ساری دولت صدقات و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف ۴۷ درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

[1] النوادر السلطانیہ صفحہ ۵-۲۴۹ [2] سلطان شافعی المذہب تھے۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند منع کیا، لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آرزو تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا، لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو، تین تین، چار چار پارے سن لیتے، بڑے خاشع، خاضع، رقیق القلب تھے، قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے، اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا، تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سنتے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، عین میدانِ جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، دینی شعائر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انہی کے ایماء سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کروایا، ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کٹھن گھڑیوں اور نازک اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شبِ جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعا میں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یبوست غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمالیں، فرمایا شاید تمھیں نیند نے

سنایا ہے، اس لئے مجھے مشورہ دیتے ہو؟ یہ کہہ کر وہ اٹھے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں موذن نے صبح کی اذان دی، میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے جھپکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہوگئے، مجھے ایک خیال آیا، اور میں نے عرض کیا کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے، اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کریں، اور اس سے گڑگڑا کر دعا مانگیں، اور یقین رکھیں کہ وہی یہ مشکل آسان کر سکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں، اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں جہاں سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی معتبر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر کچھ صدقہ کریں، پھر اذان واقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں ایک حدیث میں اس کی فضیلت اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ "خدایا مادی اسباب اور دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے آستانہ پر سر رکھ دیا جائے، اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے، اور تو ہی میرا حامی وناصر ہے۔" مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا، سلطان نے ایسا ہی کیا، میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہوگئی ہے، اور جانماز پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے کیا دعا کی، اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و اضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعیں آتی رہیں، یہاں تک کہ دوشنبہ کی صبح تک میدان بالکل صاف ہوگیا، اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رملہ کی جانب چلی گئیں۔"[1]

[1] النوادر السلطانیہ صفحہ ۵۰

محاسنِ اخلاق

عبادات وفضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو وحلم، جود وسخاوت، مروت وشرافت صبر واستقامت، شجاعت وفتوت، اور شہامت وعلو ہمت کے اوصافِ عالیہ سے آراستہ تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ "ہفتہ میں دو بار، دوشنبہ وپنجشنبہ کو اذنِ عام ہوتا تھا، فقہاء، قضاۃ وعلماء، اور اہلِ مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے، امیر غریب، بوڑھے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی، سفر وحضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات وفرامین پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحبِ غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی دادرسی کرتے، اور اس کے معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا لیکن سلطان نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت ومال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور متحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "اپنے رفقاء وخدام کی غلطیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی، لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرز عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مرا جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پی لیا

اوراس تاخیر پر کچھ نہ کہا۔[1] ایک مرتبہ سخت بیماری سے اٹھے اور غسل صحت کے لئے حمام میں گئے پانی بہت گرم تھا، ٹھنڈا پانی مانگا، خادم نے پانی حاضر کیا، پانی کچھ چھلک کر ان پر گرا، ضعف کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی، پھر ٹھنڈا پانی مانگا، اس مرتبہ ٹھنڈے پانی کا پورا طشت گر گیا، اور سارا پانی ان پر آ گیا، اور وہ مرتے مرتے بچے، لیکن صرف اتنا کہا کہ مجھے مارنے کا ارادہ ہو تو کہدو، خادم نے معذرت کی اور وہ خاموش ہو گئے، اور کوئی باز پرس نہیں کی۔[2] قاضی ابن شداد نے سرداران فوج کی غلطیوں اور اہل دربار کی بے عنوانیوں سے درگذر اور سلطان کے عفو وحلم کے متعدد موثر واقعات لکھے ہیں۔[3]

"جود وسخاوت کا یہ حال تھا کہ بقول ابن شداد بعض اوقات فتح کئے ہوئے صوبے دوسروں کو بخش دیئے آمد فتح کیا، ایک سردار ابن قرہ ارسلان نے ان سے خواہش کی اور انھوں نے بخش دیا بعض مرتبہ سامان بیچ کر وفود کو عطایا وانعامات سے نوازتے، محافظین خزانہ بعض اوقات کسی نازک وقت کے لئے کچھ چھپا کر رکھ لیتے کہ سلطان کو اگر خبر ہوگی، تو وہ رہنے نہیں دیں گے، ایک مرتبہ انھوں نے دوسروں پر رکھ کر یہ بات کہی کہ بعض ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو روپیہ اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنا ہی حال بیان کیا ہے۔[4]"

"مروت وشرافت کا یہ حال تھا کہ آنے والے اور ملاقات کرنے والے کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، خواہ کافر ہو، صیدا کا والی ملاقات کے لئے آیا، سلطان نے اس کی بڑی خاطر کی، اپنے ساتھ کھانا کھلایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی دعوت بھی دی، اور اس کے فضائل ومحاسن بیان کر کے اس کو اسلام کی ترغیب دی، اس مروت وشرافت کا نتیجہ تھا کہ اپنے سب سے بڑے حریف رچرڈ کو اس کی بیماری میں برف اور پھل بھیجتے رہے۔[5]"

لہ تاریخ ابن خلکان ترجمہ سلطان صلاح الدین ۲ ایضاً ۳ النوادر السلطانیہ ص ۲۴،۲۱ ۴ ایضاً ص ۱۴،۱۳
۵ الفتح القسی فی الفتح القدسی عماد الدین الکاتب۔

"سلطان بڑے شریف النفس، رقیق القلب اور دردمند انسان تھے ظلم کو برداشت نہ کر سکتے تھے کسی آفت رسیدہ کمزور مخلوق کی تکلیف کی تاب نہ لا سکتے، ابن شداد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عیسائی بڑھیا ان کے پاس آئی، وہ سینہ پیٹتی تھی اور برابر روئے جا رہی تھی، سلطان نے سبب پوچھا، کہا کہ میری چھوٹی سی بچی کو ڈاکو میرے خیمہ سے اٹھالے گئے، مجھے روتے روتے پوری رات ہو گئی، سلطان کے ایک آدمی نے مجھ سے کہا کہ سلطان شفیق ومہربان ہیں، ہم تمھیں ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں، تم ان سے فریاد کرنا، انھوں نے مجھے آپ کی خدمت میں پہونچا دیا، اب میں اپنی بچی آپ ہی سے لوں گی، سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا، اُن کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں اسی وقت ایک شخص کو لشکر کے بازار میں بھیجا کہ تحقیق کرے کہ کس نے اس کی بچی کو خریدا ہے، جس نے خریدا ہو اس کو قیمت دے کر اور بچی کو لے کر آئے، تھوڑی دیر میں وہ سوار بچی کو کاندھے پر لئے ہوئے نظر آیا، بڑھیا زمین پر گر گئی، اور اپنی پیشانی خاک پر رکھ کر دیر تک اپنی (مغربی) زبان میں کچھ کہتی رہی پھر خوش خوش اپنی بچی کو لے کر چلی گئی۔[1]

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ جب سلطان کسی یتیم کو دیکھتے تو محبت وشفقت کی باتیں کرتے، اور اس کی دلجوئی فرماتے، اس کو کچھ عنایت فرماتے اگر کوئی پرورش کرنے والا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے اس کا کچھ انتظام فرماتے، اسی طرح جب کسی معمر شخص یا بوڑھے کو دیکھتے تو بڑے متاثر ہوتے اس کے ساتھ کچھ سلوک کرتے۔[2]"

مردانہ اوصاف

صبر واستقامت اس درجہ کی تھی کہ قاضی ابن شداد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کمر سے گھٹنوں تک اس قدر دانے اور پھوڑے تھے کہ بیٹھنے سے معذور تھے، یہاں تک کہ دستر خوان بچھا اور کھانا تناول نہ کر سکے اس لئے کہ بیٹھنے کی قدرت ہی نہ تھی، اس کے باوجود دشمن کے مقابل صف آرا تھے، میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے

لہ النوادر السلطانیہ ص ۲۶ ۲ ایضاً ص ۲۸

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے، اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے، اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔[1]

ایک معرکہ میں حالتِ بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی بہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے، کبھی جاگتے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو اللہ کے راستہ میں سب سے آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کر کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے، اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مسلح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔[2]

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھمسان کی لڑائی میں سلطان تنِ تنہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کوتل گھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرتے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر ٹھہرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے، چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی،[3] انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلہ میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی،[4] ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اوپر ستر

1 النوادر السلطانیہ ص۱۸ 2 ایضاً ص۱۹ 3 ایضاً ص۱۵ 4 ایضاً

جہاز عکہ میں آئے، میں عصر سے مغرب تک گنتا رہا، لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکہ کے سب سے بڑے معرکہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، قلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طاشے زمین پر گر گئے، لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے، یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو للکارا اور شرم دلائی، اور وہ میدان میں واپس آئے، اور دوبارہ حملہ کیا، جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی،[1] سلطان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان نے ایک روز فرمایا کہ "میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں، اور سمندر میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہونچوں، اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے، یا میں اس ارادہ میں کام آجاؤں"۔[2]

علم و فضیلت

سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ اُن کے مشہور گھوڑوں کے سلسلہ نسب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات اُن کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے معلومات رکھتے تھے، ان کے ہمنشینوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں،[3] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ ان کو حماسہ حفظ تھا،[4] لین پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اس کا اصلی رجحانِ طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سنتے، ان کے براہین اور راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا انہماک رہتا تھا، اور سب سے بڑھ کر اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت والجماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے"۔[5]

1 النوادر السلطانیہ ص۱۵ 2 ایضاً ص۱۷ 3 ایضاً ص۲۷ 4 ایضاً 5 سلطان صلاح الدین۔

فاطمی حکومت کا زوال اور صلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں اقتدار عبیدی سلطنت[1] (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۲۹۹ھ سے ۵۶۷ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی، اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ کے عقائد، اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، یہ دورِ حکومت اعتقادی عجائبات، عجیب و غریب احکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پُر تھا جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب "الخطط والآثار" سے پیش کئے جاتے ہیں :۔

۳۶۲ھ میں قانونِ میراث میں ترمیم کی گئی، اور قانون بنایا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے چچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ عداوت کا مرادف سمجھا جاتا ہے، ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا، روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔

۳۷۲ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری ممانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے پائے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زدو کوب کیا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوٰۃ الضحیٰ (نماز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں ملوخیا (ایک ترکاری) کو جو اہلِ مصر کو بہت مرغوب ہے، اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، جرجیر کی اس لئے ممانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سنہ میں تمام مساجد، دیواروں، مقابر اور صحراؤں میں سلف کو سب و شتم اور لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۴۱۱ھ میں "الظاھر لاعزاز دین اللہ" نے شراب کی عام اجازت

[1] محققینِ انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندانِ نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورثِ اعلیٰ عبید مجوسی یا یہودی تھا، قاضی ابو بکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب "الکشف عن اسرار الباطنیۃ" اور قاضی عبد الجبار نے کتاب "تثبیت النبوۃ" اور مقدسی نے اپنی کتاب "کشف ما کان علیہ بنو عبید" میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دی، عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرانی اور بیماریوں کا زور تھا، لوگ محل شاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور "الجوع الجوع" (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے، لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔

۴۲۴ھ میں ولی عہد کی جس کی عمر ۴ سال کی تھی، سواری نکلی تمام بازار آراستہ تھے، لوگ زمیں بوس ہوتے تھے۔

ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے، جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض قرار دی گئی، مستنصر باللہ جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، آمر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی، الفائز بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاضد لدین اللہ کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیارہ سال تھی"۔[1]

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت و رفض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جابجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے، رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر مقریزی لکھتا ہے :۔

واختفى مذهب الشيعة والاسماعيلية	شیعہ، اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب روپوش ہو گیا،
والامامية حتى فقد من ارض مصر كلها.	یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دورِ ابتلا تھا جس میں مسلسل شریعت و سنت اور عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تلاعب جاری رہا، اہلِ سنت اور اہلِ علم مقہور و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت اوباش مزاج، اور بد دین غالب و حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب "کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین" میں اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

وبقى هذا البلاء على الاسلام من اول	عبیدیوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ بلا

[1] کتاب الخطط والآثار للمقریزی ص۳۴۰، ۳۵۵

دولتهم الی اٰخرها وذلك من ذی الحجة سنة تسع وتسعين ومائتين الی سنة سبع وستين وخمسائة وفی ایامهم كثرت الرافضة واستحكم امرهم ووضعت المكوس علی الناس واقتدی بهم غيرهم وافسدت عقائد طوائف من اهل الجبال الساكنين بثغور الشام كالنصيرية والدروزية والحشيشة نوع منهم وتمكن دعاتهم منهم لضعف عقولهم وجهلهم ما يتمكنوا من غيرهم واخذت الفرنج اكثر البلاد بالشام والجزيرة الی ان منّ الله علی المسلمين بظهور البيت الاتابكی وتقدمه مثل صلاح الدين فاستردوا البلاد وازالوا هذه الدولة عن ارقاب العباد۔[1]

اسلام پر مسلط رہی اس کی ابتدا ذی الحجہ ۲۹۹ھ سے ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ پر ہوتا ہے ان کے دور حکومت میں روافض کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا، لوگوں پر محاصل اور ٹیکس مقرر کیے گئے اور دوسروں نے ان کی اقتدا کی شامی حدود پر بسنے والے کوہستانوں نصیریوں، دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے، حشیشی (بھنگ استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قسم ہیں، ان اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کوہستانیوں کے اندر ان کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا، وہ دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دورِ حکومت میں فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر قبضہ کرلیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ خاندان اتابک برسر اقتدار ہوا، اور صلاح الدین جیسے مجاہد سامنے آئے جنھوں نے اسلامی ملک از سر نو بازیاب کیا، اور اس حکومت سے بندگانِ خدا کو نجات دی۔

اس انقلابِ سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان اور محبینِ سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجہ میں پیش آئے تھے،

[1] کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین ج ۱ ص۲۰۱

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

انقرضت تلك الدولة وزالت عن الاسلام بمصر بانقراضها الذلة۔[1]

یہ حکومت ختم ہوئی، اور اس کے ساتھ مصر میں اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہونچا۔

حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "الصواعق المرسلة" میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات، پھر نورالدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پُرجوش الفاظ میں کیا ہے:۔

"ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہو گئی، اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی اور اس کے پنجے جم گئے، اور اس کے علمبردار مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے پھر انھوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہونچ گئے، انھوں نے اس پر قبضہ کرلیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انھوں نے اور ان کے حکام و قضاۃ نے کھلے طریقہ پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل اخوان الصفا تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے "اشارات" اور "شفا" اور دوسری تصنیفات کیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ میرے والد حاکم باللہ (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلغین میں سے تھے ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا چلن موقوف ہوا، اور کتب سنت بالائے طاق رکھ دی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت کا تمغۂ امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا قبضہ رہا، اہلِ سنت ان کے دورِ حکومت اور ان کی مملکت میں ذمیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت) کی طرح رہتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا، جو اہلِ سنت کو نصیب نہ تھا، کتنے علماء اس دور میں قابلِ گردن زدنی قرار پائے کتنے وارثین انبیاء ان کے قید خانوں میں پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

[1] ایضاً ص۲۰۲

آخر غیرتِ الٰہی کو جوش آیا، اور نورالدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو ان باطنیوں کے پنجۂ غضب سے چھڑایا، ان ملکوں میں اسلام کا دمِ واپسیں معلوم ہوتا تھا، لیکن اس انقلاب سلطنت سے اسلام کو نئی زندگی عطا ہوئی، اور اس کا آفتابِ اقبال گہن سے نکلا، اور روئے زمین کے مسلمانوں کو اس سے مسرت ہوئی، جب کہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دورِ ابتلا میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندے اور لشکرِ مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستاران صلیب سے آزاد کرایا، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دینِ حق کی نصرت کا حق ادا کیا۔"[1]

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص اس اطلاع کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔[2]

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدینِ صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بدنظمی اور مغربی ترکتازوں کی ہوس کا شکار بننے سے صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بفاطمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے ایک چشمۂ فساد کو بند کر دیا، جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا رہا تھا، اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا، تاریخِ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی، اور کسی ملک کا مسلمان اس کردی مجاہد کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

[1] الصواعق المرسلہ علی الجہمیہ والمعطلہ ج ۱ صـ ۲۳۲، ۲۳۳ [2] کتاب الروضتین ج ۱ صـ ۱۹۸، ۱۹۹

شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں، ان کی علمی و دینی سرپرستی، جابجا دینی مدارس کے قیام، نیز شیعی اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلّم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سرِ نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ باعظمت شخصیت شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی و بیباکی میں نادرۂ روزگار اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عزالدین بن عبدالسلام دمشق میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، اساتذۂ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم حاصل کی، جن میں فخرالدین بن عساکر، سیف الدین آمدی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلّہ علماء و اساتذۂ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انھوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر حاصل کر لیا، اور ان کے معاصرین نے ان کی علمی جلالتِ شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علامہ ابن دقیق العید نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبدالعظیم المنذری صاحب کتاب "الترغیب و الترہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی، اور کہا کہ جس شہر میں عزالدین بن عبدالسلام ہوں، وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عزالدینؒ کا پایہ امام غزالی سے بلند ہے۔[1]

ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:-

انتهت اليه معرفة المذهب مع الزهد والورع وبلغ رتبة الاجتهاد۔[2]	فقہ کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل تھا، اور درجۂ اجتہاد کو پہونچے ہوئے تھے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے عرصہ تک دمشق میں "زاویۂ غزالیہ" میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان[3] کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور متردد تھے، الملک الکامل نے دمشق کے عہدۂ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک الکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۳ [2] حسن المحاضرۃ للسیوطیؒ ص ۱۴۱ [3] صلوۃ الرغائب ایک نماز تھی، جو ستائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۴۴۸ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو اتحاف السادۃ شرح احیاء ص ۴۲۳، نصف شعبان پندرہویں شب کو سو رکعتیں خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع، منکر اور قبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں (اتحاف السادۃ۔ ج ۳ ص ۴۲۵-۲۷)

سلاطین کو صلاحِ نیک اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عزالدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی، جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا درباداری کرنا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہلایا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک العادل ابوبکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں، جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ ان شاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیحد مسرور ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا،[1] سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

---

[1] چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول دے دیا گیا، اور رائی کا پہاڑ بن گیا، تحزب و تعصب نے اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عزالدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدۃً و علماً اشعری تھے، الملک الاشرف حنابلہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتداء میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی معلومات کے بعد اس کی بدگمانی دور ہو گئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ۔ ج ۵ ص ۸۵، ۹۵)

مجھے معاف فرمائیں، میرے لئے دعا بھی فرمائیں، اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پُرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں، جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی، اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے: "فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ"۔

باقی رہی دعا تو میں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے، جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، رہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوحات اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا رُخ الملک الکامل سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک الکامل آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا رُخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنانِ اسلام کی طرف پھیر لیں، اور اس آخر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سربلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے، تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں، اور آپ کے نامۂ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ اور فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جاتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رُخ بجائے مصر کے (جو الملک الکامل کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے، اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملک الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے، اور نائبین سلطنت اور اہل کاران حکومت رنگ رلیاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں، آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گندگیوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں، اور اہل معاملہ کی دادرسی کریں، الملک الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا، کہ میری یہ ملاقات خالصۃً لوجہ اللہ تھی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمٰعیل (ابوالجیش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہِ مصر کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور ثقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آ کر ہتھیار خریدتے، شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آ کر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انھوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الٰہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دشمنانِ دین کو ذلّت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقّت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی، شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثنا میں سلطان صالح اسمٰعیل، الملک المنصور والیٔ حمص، اور سلاطینِ فرنگ اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمٰعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد و خواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں، اور ان کی تنظیم و تکریم اور ان کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیازمندانہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کر لیں، تو یہ قصہ رفع دفع ہو جائے گا، اور آپ اضافہ و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاہ ان یقبل یدی	اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ
فضلاً عن اقبل یدہ، یا قوم انتم فی واد	میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی
وانا فی واد والحمد للہ الذی عافانی	کروں؟ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں
مما ابتلاکم بہ۔ (طبقات الشافعیہ۔ ج۵ ص۱۰۱)	خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کر لوں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہو سکے اس میں دریغ نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہاں! کہا جانتے ہو یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (هذا اکبر قسوس المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعے سپرد کر دینے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے پیتے۔[۱]

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسمٰعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔

راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزر ہوا تو والیٔ کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:-

"تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک الصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاصؓ کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدۂ قضا اور ویران مساجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صالحیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم و اشاعتِ علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنتِ مصر کا منتظم اعلیٰ تھا

[۱] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۰۱ بروایت شیخ شرف الدین عبداللطیف فرزند شیخ عزالدین ابن عبدالسلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عزالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مساجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخرالدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا، اس کارروائی سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا دینی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفۂ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطانِ مصر کا پیغام پہونچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطانِ مصر کی زبان سے سنا ہے، یا کسی کے واسطہ سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخرالدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخرالدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عزالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کرسکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی، اور براہِ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہوکر خلیفہ کو پیغام پہونچایا۔

ان کی جرأت کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے تزک و احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دو رویہ افواجِ شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہوکر آداب و تسلیمات بجا لاتے تھے اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعتہً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ "ایوب! خدا کو تم کیا جواب دوگے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟ بادشاہ نے کہا کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے ناگفتنی کام ہورہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے دادِ عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہورہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ "پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جن کا جواب یہ ہوتا ہے، "إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ" (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں منظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو، اور وہ اپنے نفس کا شکار ہوجائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بلّے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔[1]

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہونچ گئیں، اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کرلیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابتِ دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رُخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہوئے۔[2]

مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالمِ اسلام پر جابجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثناء میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ "پہلے اپنے محل کے جواہرات، اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو، ارکان سلطنت،

[1] طبقات الشافعیہ ص۸۴ [2] ایضاً ص۸۴

اور امراء دربار اپنی اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں، جو حرام ہیں، اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون وچرا جواہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کردیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلاً ترک تھے، اور سلطنتِ مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کردی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سرِ بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے، اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کرلیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھر والوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہولیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی، اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عزالدین چلے گئے تو تمھاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یہ سن کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس ارادہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آگیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عملہ کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹ کھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ "بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہو" یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا "میں تمہارا نیلام کروں گا" اور تمہیں فروخت کروں گا" اس نے کہا کہ "ہماری قیمت آپ کس مد میں صرف کریں گے؟" فرمایا! "مسلمانوں کے کاموں میں" اس نے عرض کیا کہ "قیمت وصول کون کرے گا" فرمایا "میں خود" اس نے کہا "بہت اچھا" چنانچہ شیخ نے ایک ایک کرکے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے، اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کرکے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے[1]، ابن السبکی لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا" ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عزالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۴، ۸۵

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امراء کا دورِ حکومت آیا، وہ سب شیخ کے قدردان اور نیازمند ہے، اور ان کی تعظیم وتکریم اور بزرگداشت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس، شیخ کا بڑا ادب شناس، اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوطِ بغداد اور سلطنتِ عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ ۱۲۶۱ء میں مصر میں اعزاز واکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عزالدین نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیبرس نے، پھر قاضی القضاۃ تاج الدین وغیرہ نے۔[1]

مکارمِ اخلاق

شیخ اپنے علم وفضل، وقار وہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور مخیر تھے، قاضی القضاۃ بدرالدین بن جماعہ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانۂ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بکنے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک باغ خرید لیں، انھوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ "ہاں! مگر جنت میں، میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی، انھوں نے فرمایا، جزاك الله"۔

قاضی القضاۃ موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور مخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عمامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے۔

شیخ عزالدین صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور حق گو نہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

۱؎ حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۴۹

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانۂ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کروا دیا کہ جس کو ابن عبدالسلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔[1]

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالامال تھے، اگرچہ ان کے ایمان ویقین، اعتماد علی اللہ، بےخوفی وشجاعت، اربابِ دنیا کی بےوقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد وتربیت کے لئے مجاز تھے،[2] سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلیؒ سے بھی ملاقات واستفادہ کا ذکر کیا ہے۔[3]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی ونظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علانیہ مخالفت وانکار علماء کا فریضہ ہے، اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات اور شدائد بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملک الاشرف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

وبعد ذلك فانا نزعم انا من جملة	ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں سے
حزب الله وانصار دینه وجنده	ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
وكل جندی لا یخاطر بنفسه فلیس	ہیں، وہ لشکری جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
بجندی۔[4]	تیار نہ ہو، وہ لشکری نہیں ہے۔

۱؎ حسن المحاضرہ ص ۱۴۲ ۲؎ طبقات ج ۵ ص ۸۳ ۳؎ حسن المحاضرہ ص ۱۴۲ ۴؎ طبقات ج ۵ ص ۹۵

ان کا خیال تھا کہ علم وزبان علماء کا ہتھیار ہیں، اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

قد امرنا الله بالجهاد فی نصرة دينه، الا ان سلاح العالم علمه ولسانه كما ان سلاح الملك سيفه وسنانه، فكما لا يجوز للملوك اغماد اسلحتهم عن الملحدين والمشركين لا يجوز للعلماء اغماد السنتهم عن الزائغين والمبتدعين۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و جدوجہد کا حکم دیا ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے، جیسا کہ بادشاہ کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر وسنان ہے، تو جس طرح بادشاہوں کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں، اسی طرح علماء کے لئے اہلِ زیغ وضلال اور مبتدعین سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے، جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں، اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:۔

والمخاطرة بالنفوس مشروعة فی اعزاز الدين، ولذلك يجوز للبطل من المسلمين ان ينغمر فی صفوف المشركين وكذلك المخاطرة بالامر بالمعروف والنهی عن المنكر ونصرة قواعد الدين بالحجج والبراهين

دین کے اعزاز وغلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا دین میں مشروع ہے اسی لئے مسلمان شہزور کے لئے جائز ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور اصول دین کی دلائل وبراہین کے ذریعہ تقویت مشروع ہے،

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۹-۱۲

مشروعة فمن خشی علی نفسه سقط عنه الوجوب وبقی الاستحباب ومن قال بان التغرير بالنفوس لا يجوز فقد بعد عن الحق ونأى عن الصواب وعلى الجملة فمن آثر الله على نفسه آثره الله ومن طلب رضا الله بما يسخط الناس رضی الله عنه وارضی عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما يسخط الله سخط الله عليه وأسخط عليه الناس وفی رضا الله كفاية عن رضا كل احد۔ (طبقات ج ۵ ص ۹۱)

البتہ جس کو اپنی جان کا خطرہ ہو اس سے وجوب ساقط ہو جائے گا، اور استحباب باقی رہے گا، جس کا خیال ہے کہ جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز ہی نہیں وہ حق سے بہت دور ہو گیا اور اس کا یہ خیال بالکل صحیح نہیں، خلاصہ یہ کہ جو اللہ کو اپنے نفس پر ترجیح دے گا، اللہ اس کو دوسروں پر ترجیح دے گا، اور جو لوگوں کو ناراض کر کے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ اس سے خود بھی راضی ہو جائے گا، اور لوگوں کو راضی کرے گا، اور جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ اس سے ناراض ہوگا، اور لوگوں کو بھی ناراض کرے گا۔

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:۔

فليتك تحلو والحياة مريرة — وليتك ترضى والانام غضاب

(کاش کہ آپ کی محبت کی حلاوت مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہوتی، اور کاش کہ آپ مجھ سے راضی ہو جاتے چاہے ساری دنیا ناراض ہوتی۔)

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلافِ شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن وعہدہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور متبحر مفتی تھے، اسی طرح کہنہ مشق مصنف بھی تھے،

ان کی تصنیفات میں "القواعد الکبریٰ" اور کتاب "مجاز القرآن" خاص وقعت رکھتی ہے، ابن السبکی لکھتے ہیں:۔

وھذان الکتابان شاھدان بامامته وعظیم منزلته فی علوم الشریعة۔[1]

یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت میں ان کے علو منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے، ابن السبکی نے ان کی دو اور کتابوں "شجرۃ المعارف" اور "الدلائل المتعلقة بالملائكة والانس علیہم السلام" کی بھی خصوصی تعریف کی ہے، ان کی ایک کتاب "مقاصد الصلاۃ" خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی، اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں،[2] چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے، جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالیؒ کے بعد شیخ عز الدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شرعیہ کے مقاصد ولطائف پر گفتگو کی، اور شریعت کے اسرار ونکات بیان کئے، اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحبؒ محدث دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں حجۃ الاسلام غزالی، ابو سلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عز الدین کا نام لیا ہے۔[3]

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۰ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک الظاہر بیبرس کا عہد حکومت تھا، اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے، شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی، جنازہ میں امراء دربار، ارکانِ سلطنت اور افواجِ شاہی شریک تھیں، سلطان نے خود کاندھا دیا، اور دفن میں شریک ہوا۔

شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا اژدحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے، اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلائق ہے اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی، اس کے انتقال کے بعد مجھے اب اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔[4]

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۰۳ [2] ایضاً ج ۵ ص ۹۸ [3] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵ مطبع صدیقی [4] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۸۴

فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

تاتاری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کر دے، یہ تاتاری غارتگروں کا حملہ تھا، جو مور وملخ کی طرح مشرق سے بڑھے، اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطانِ وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاتاری تاجروں کو قتل کرا دیا، جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے، پھر جب چنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کرا دیا، اس پر تاتاری خاقان چنگیز خاں نے برافروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال واخلاق کے نتائج اور اقوام وملل کے عروج وزوال کا جو ابدی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے، اور خاص طور پر سورۂ اسراء کی ابتداء میں بنی اسرائیل کی تباہی، قتل عام ونکبت وذلت، اور بیت المقدس کی تخریب وبے حرمتی کی جو داستانِ عبرت سنائی گئی ہے،[1] اس کی روشنی میں اس فتنۂ عالم آشوب

[1] اس موقع پر سورۂ اسراء کی آیات "وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا" سے "وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا" تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیائے اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلاب عالم اسلام پر امنڈ پڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلامیہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ منحوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھے اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال پیچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع و زرخیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہوگئی، دنیا کے بہت سے بانیانِ سلطنت اور اولوالعزم فرمانرواؤں کی طرح[1] اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہوسکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افرادِ خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گذر چکا ہے، اس طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرمان ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار باران اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جد و جہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

[1] ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا، اور مصر جیسے زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی پیٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۶ھ میں جبکہ چچا بھتیجے الملک العادل اور الملک الافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی، اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازاری تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابوشامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک العادل (سلطان مصر) نے صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، مؤرخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا،[1] سنت اللہ کے مطابق آسمانی تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آرہے تھے، جو توبہ، انابت اور اصلاحِ حال کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۷ھ میں ایک عظیم زلزلہ آیا، جس کی زد میں خاص طور پر ملکِ شام، بلادِ روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرأۃ الزمان" کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مبالغہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔

ادھر یہ غیر معمولی حوادث پیش آرہے تھے، جو مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بالکل کافی تھے، ادھر عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادرکشی کا سلسلہ جاری تھا، ۶۰۱ھ میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ ہوئی، ۶۰۳ھ میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے مسلمان کا خون بہایا، ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر (۶۰۳ھ) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البدایۃ والنہایۃ" ج ۱۳ ص ۲۶ حوادث ۵۹۶ھ۔

۶۰۰ھ میں جزیرہ[1] کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی[2] اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر دمیاط پر قبضہ کرلیا، جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مرکز خلافت دار السلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت عجمی تکلفات اور دولت و تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گئے تھے، خلفاء کے منظورِ نظر مصاحبین اور معتمدین کی دولت (جو غلام کی حیثیت سے حریمِ خلافت میں داخل ہوتے تھے، اور فراش، ساقی، مہتمم توشک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زرخرید علاء الدین الطبرسی الظاہری کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نجی جائداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی نظیر نہ تھی، یہی حال مجاہد الدین ایبک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی میں جو جہیز دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے آخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ لاکھ دینار سالانہ تھی، یہی حال الصلاح عبد الغنی بن فاخر فراش کا تھا، جو زیورِ علم سے عاری، لیکن شاہانہ معیار کی زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے، ان میں سے بڑے بڑے استاذ کو ۱۲ دینار ماہوار سے زیادہ نہیں ملتے تھے، جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشرابی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک امیر کی شادی میں لٹائے، اور تین ہزار دینار شرابی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں موصل سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے[3]۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے سارا شہر

---

[1] جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اس کو بلاد ما بین النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ "الجزیرہ" کے نام سے مشہور ہے، اور جنوبی مشرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے۔ [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۵۹

[3] یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں "الحوادث الجامعہ" اور "العسجد المسبوک" سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے، ان کا تماشا دیکھنے میں محو اور خود فراموش ہوجاتا تھا، نمود و نمائش کے ماسوا جس طرح بے تکلف دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے، اور نمازیں قضا ہوتی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ ۶۴۰ھ کے عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا، وہ رات کو جاکر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضا کرکے پڑھی[1]، اسی طرح ۶۴۴ھ کی عید الاضحیٰ کو اہلِ بغداد شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے، اور نماز عید انھوں نے غروبِ آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی دستور تھا، اور اس میں کسی کو کوئی قباحت نہیں محسوس ہوتی تھی، جائدادوں کی ضبطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہوگئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھ گئی تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی، اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا[2]۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری، ایران و ترکستان کو تہ و بالا کررہے تھے، اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد پر ان کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۲۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ "اس سن ہجری کی ابتدا اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایک دوسرے سے نبرد آزما اور برسر پیکار ہیں" دار الخلافت بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۴۰ھ سے ۶۴۳ھ تک خلفاء اسلام کے قدیم و مسلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا، اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا، ۲۱ دن تک بیت اللہ شریف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بد شگونی لی۔

۵۷۵ھ میں الناصر لدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیالیس سال سے زیادہ مسلسل خلافت و حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے، جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافتِ عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

---

[1] الحوادث الجامعہ، واقعات ۶۴۰ھ [2] ملاحظہ ہو مضمون "عصر الشرابی ببغداد" از ناجی معروف رسالہ "الاقلام" بغداد محرم ۱۳۸۶ھ۔

مذمت کی ہے، مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

"رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ویران ہوگیا، ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہوگئے، اس نے اُن کی جائدادیں اور دولتیں ضبط کرلیں، اس کے کاموں میں بڑا تضاد تھا، آج ایک بات کرتا تھا، کل اس کے خلاف، اس کو تمام تر دلچسپی تفریحی مشاغل سے تھی، اس نے جوانمردی و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون سپہ گری کا عراق سے خاتمہ ہوگیا، خلیفہ کی شیفتگی ان تفریحات سے حد کو پہونچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب سے پہلے تاتاریوں کو اسلامی قلمرو پر حملہ کرنے کی طرف متوجہ کیا[1]، اور ان کے پاس پیام بھیجا[2]"۔

۶۲۲ھ میں الناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی، اور مستنصر باللہ (۶۲۳۔۶۴۰ھ) اس کا جانشین ہوا، یہ خلیفہ دیندار، پاکباز، نیک سیرت، پاکیزہ خصائل اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا[3]، لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۴۰ھ میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار، محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی مسکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دوشنبہ اور جمعرات اور ماہِ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مؤرخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر حریص اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۴۲ھ میں ابن العلقمی کے نام خلافتِ عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعۂ فال نکلا[4]، خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا،

---

[1] خوارزمی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے، [2] تاریخ الکامل ج ۱۲ ص۱۸۱۔

[3] ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص۱۵۹ [4] پورا نام مؤید الدین ابوطالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے[1]، ان واقعات سے ان کے دل میں بددلی کا پیدا ہونا اور جذبۂ انتقام کا اُبھرنا بعید از قیاس نہیں، اس وقت اگرچہ تاتاری خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاتاری فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعراء نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے[2]۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ کا فساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہونچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمراں خاندانوں کے آخری افراد اور کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعار، اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلۂ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہونچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروؤں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ اللہ کے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور یکسو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص۱۹۶ [2] ایضاً ص۲۰۱

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزرجی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"جاگیروں اور جائدادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رفاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، عمال سلطنت نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ :۔

"یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تو رہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی۔"[1]

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شرکت غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیائے کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ، اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا حوصلہ مند عالی ہمت اور کشورکشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ - ۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ لیمب (H. LAMB) اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں صحیح لکھتا ہے :۔

"اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر خدائے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلی گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا جنھوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین مملوک سے قطع نظر کر کے جو روز افزوں ترقی پر تھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں، ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصرلدین اللہ اس سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو مانتے تھے، خلیفۂ

[1] ملاحظہ ہو مضمون "عصر الشرابی ببغداد" از ناجی معروف رسالہ "الاقلام" بغداد شمارہ محرم ۱۳۸۶ھ۔

بغداد دنیاوی اقتدار سے محروم ہو کر پاپائے روما کی طرح صرف دین کا ہادی و رہنما رہ گیا تھا۔"[1]

عرب مورخین علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر شخصی عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلابت کا عام طور پر اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں، جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر مختتم سلسلۂ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے تھک کر چور ہو گیا تھا، ان زرخیز و مردم خیز ممالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی ہوئی رہتی تھی، مفتوحہ ممالک کی دولت شاداب و حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی تراش و خراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گیا تھا، اور فراغت و امارت اور فتوحات کے سارے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے، جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے تو اہل دل صوفیا و مشائخ اور مصلحین کی بیاضوں، ملفوظات اور مواعظ میں، جن کا بڑا حصہ تاتاری سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ ہیرلڈ لیمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ :۔

"مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو نغمہ و سرود سے بھی شغل رکھتی تھی اور کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک ہیجان کی حالت ہمہ وقت ضرور رہتی تھی، بادشاہوں کی جگہ غلام اور مملوک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

[1] چنگیز خاں ص ۱۴۷ ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم۔

اور ملکی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظامِ امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹتے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی، اور ایمان کا مالک خدا تھا۔"[1]

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الٰہی قانونِ مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع واستحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی، اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہونچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبۂ دینی سے قطع نظر کرکے سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتداءً اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں[2] کی قیادت میں عذابِ الٰہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران وترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذرا ہے، اور بالآخر انھوں نے ٦٥٦ھ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی "وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ"۔

عالم اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف وخطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال

[1] چنگیز خاں ص١٣٣ ہیرلڈ لیمب ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم [2] چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ٥٩٥ھ سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ٦١٦ھ میں ہوا، اس کا انتقال ٦٢٤ھ میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی تکمیل کی ٦٥٦ھ میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں، خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہوگئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔[1]

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب "چنگیز خاں" میں لکھتا ہے:۔

"لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک بخت ختم ہوگئے، اور یہ اس طرح پیش آیا کہ قراقورم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آرہا تھا کہ راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا نام اینل جق تھا، قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کرلیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، اینل جق کا یہ خیال بالکل قرینِ عقل تھا۔

حاکم اترار کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقورم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کر دیئے گئے، اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کرا دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں جلوا دیں، اس سفارت میں سے جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس واپس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوبی کا خان حال سنتے ہی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایلچی کو مار ڈالنا ایسا فعل تھا، جسے بغیر سزا کے چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان نہیں رہ سکتے"۔[2]

[1] ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ج ١٣ ص ٨٠-١٣٠، الکامل لابن الاثیر ج ١٢ ص ١٤٩ [2] چنگیز خاں ص ١٤٣ ہیرلڈ لیمب۔

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور اس کو ایک تودہ خاک بنادیا، شہر کی آبادی میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کردیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، یہی حشر عالمِ اسلام کے نامی گرامی شہروں رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرمانروا اور سب سے طاقت ور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے، یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے قضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی میں ضم کرلیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں سو مسلمان موجود تھے، کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کرکے سب کو قتل کردیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سارے گھر والوں کو قتل کردیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہما پڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔[1]

تاتاری یورش عالمِ اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں، مسلمان مبہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا،

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الکامل" (ابن اثیر) ج ۱۲۔ اور دائرۃ المعارف (بستانی ج ۶۔ مادہ تتر)

تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "إِذَا قِيلَ لَكَ إِنَّ التَّتَرَ انْهَزَمُوا فَلَا تُصَدِّقْ" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو کہیں شکست ہوئی ہے، تو یقین نہ کرنا" جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رُخ ہوجاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی خیر نہیں تھی، تاتاریوں کا رُخ کرنا بربادی، قتلِ عام، ذلت و بے آبروئی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالمِ اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آگیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے، اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدرد ہوجاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا، وہ لکھتا ہے:

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس و پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں، اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے، اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے؟ کاش میں نہ پیدا ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مرچکا ہوتا، اور بھولا بسرا ہوجاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثۂ عظمیٰ اور مصیبتِ کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کردیئے، اور

پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا، یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا۔[1]

"مرصاد العباد" کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد عینی ہے اور جس کا مولد رے اور مسکن ہمدان اس تاتاری غارت گری کے نذر ہو چکے تھے، لکھتا ہے:۔

"تاریخ شہور سنہ سبع و عشر وستمائۃ لشکر مخذول کفار تاتار خذلہم اللہ ودمرہم" استیلا یافت برآں دیار وآں فتنہ وفساد وقتل وہدم وحرق کہ ازاں ملاعین ظاہر گشت در ہیچ عصر در زمان کفر و اسلام کس نشان نہ دادہ است، و در ہیچ تاریخ نیامدہ وقبل ازیں بیشتر چگونہ بود کہ از یک شہرے کہ مولد و منشاء ایں ضعیف است قیاس کردہ اند کہ بیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است واسیر گشتہ از شہر و ولایت وفتنہ وفساد آں ملاعین مخاذیل بر جملگی اسلام و اسلامیاں ازاں زیادت است کہ در حیز عبارت گنجد، وایں واقعہ ازاں شائع تر است در جہاں کہ بشرح حاجت فتد واگر عیاذاً باللہ غیرت و حمیت اسلام در نہاد ملوک و سلاطین بجنبد کہ عہدۂ رعایت مسلمانی و مسلماناں در ذمۂ ایشاں است کہ "الامیر راع علی رعیتہ وھو مسئول عنھم" و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشاں نگیرد تا باتفاق جمعیتے کنند و کمر انقیاد فرمان "اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفع ایں فتنہ فدا کنند بوے آں می آید کہ بیک بارگی مسلمانی برانداختہ شود واکثر بلاد اسلام برافتاد ایں بقیت را نیز براندازند و جہان کفر گیرد ونعوذ باللہ خوف وخطر آں است کہ مسلمانی آں قدر اسمے کہ ماندہ بود شومیٔ معاملہ مدعیان بے معنی چناں برخیزد کہ نہ اسم ماند نہ رسم"[2]

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری متمدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ براندام تھی، جہاں

[1] الکامل (ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ) ج ۱۲ صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸ [2] مرصاد العباد (قلمی) (محفوظ کتب خانہ ندوۃ العلماء) ص ۸

ان کے پہونچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، گبن اپنی مشہور کتاب "تاریخ انحطاط و سقوط روما" میں لکھتا ہے:۔

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سُنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"

کیمبرج کی "تاریخ عہد وسطیٰ" کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خاں تھا بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ مغلوں کو روک سکیں، دشت و صحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے، پہاڑ، سمندر، موسمی سختیاں، قحط، وبائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا، کسی قسم کے خطروں کا انھیں خوف نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لا سکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں میدانِ تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا جس نے بہت سی ملکی اور سیاسی قضیوں کا چشم زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انھیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کئے وہ حل نہ ہوتے، اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قوبیلائی خاں پر ختم ہوگیا جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور بسیط سلطنت نے تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع کر دیئے، ایسی طاقت پھر کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی۔"[1]

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۶۵۶ھ میں چنگیز خاں

[1] ماخوذ از "چنگیز خاں" صفحہ ۲۶۶

کے پوتے ہلاکو خاں کی سرکردگی میں دنیائے اسلام کے دارالخلافت اور اس عصر کے سب سے بڑے علمی مرکز اور متمدن شہر بغداد میں داخل ہوئے، اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، بغداد کی تباہی اور مسلمانوں کے قتل عام کی تفصیل طویل اور بہت دردناک ہے کچھ اندازہ ان مورخین کے بیانات سے ہوگا جنھوں نے اس حادثہ کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور اس کی تفصیلات دیکھنے والوں سے سنیں، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"بغداد میں چالیس دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا، چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پُر رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران و تاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے، بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے تھے کہ ٹیلے نظر آتے تھے، ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں، اور سارے شہر میں بدبو پھیلی جس سے شہر کی ہوا خراب ہو گئی، اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر شام تک پہونچا، اس ہوا اور وبا سے بکثرت مخلوق مری، گرانی، وبا اور فنا، تینوں کا دور دورہ تھا۔"[1]

شیخ تاج الدین السبکی لکھتے ہیں:۔

"ہلاکو خاں نے خلیفہ بغداد (مستعصم) کو ایک خیمہ میں اتارا اور وزیر ابن العلقمی نے علماء و اعیان شہر کو دعوت دی کہ خلیفہ اور ہلاکو کے صلحنامہ پر گواہ بنیں، وہ آئے تو ان سب کی گردن اڑادی گئی، اسی طرح ایک ایک گروہ یکے بعد دیگرے بلایا جاتا اور اس کی گردن اڑادی جاتی، پھر خلیفہ کے معتمدین و مقربین کو بلایا گیا اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا، خلیفہ کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ اگر اس کا خون زمین پر گرا تو کوئی بڑی آفت آئے گی، ہلاکو کو تردد تھا، نصیر الدین طوسی[3] نے کہا کہ یہ کچھ مشکل بات نہیں، خلیفہ کا خون نہ بہایا جائے، بلکہ

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص۲۰۲، ۲۰۳ [2] ایک ایرانی فاضل کی تاریخ "اخبار و آثار خواجہ نصیر الدین طوسی" شائع کردہ طہران یونیورسٹی سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے؛ اس کتاب کے ایرانی مصنف نے بھی نصیر الدین طوسی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

[3] طوسی کی سب سے بڑی سیاسی چال جو بالآخر کامیاب ہوئی، یہ تھی کہ ہلاکو کو اس نے خلافتِ عباسیہ کی بیخ کنی پر ابھارا اور قصر خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ہلاکو خود بھی اپنے بھائی منکو قاآن کی طرف سے اس پر مامور تھا کہ باطنیوں کے استیصال

(باقی ص۳۱۹ پر)

دوسری طرح اس کی جان لی جائے، چنانچہ اس کو فرش میں لپیٹ دیا گیا، اور ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کو ختم کر دیا گیا۔"

بغداد میں ایک مہینہ سے زیادہ قتل عام جاری رہا، اور صرف وہی بچ سکا، جو چھپا رہا، کہا جاتا ہے کہ ہلاکو نے مقتولین کو شمار کرایا، تو ۱۸ لاکھ مقتول شمار ہوئے۔[1]

عیسائیوں کو حکم دیا گیا کہ علانیہ شراب پئیں اور سور کا گوشت کھائیں، اگرچہ رمضان کا زمانہ تھا مگر مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ شرکت کریں، مسجدوں کے اندر شراب انڈیلی گئی، اور اذان کی ممانعت کر دی گئی، یہ وہ بغداد ہے جو (جب سے آباد ہوا) کبھی دارالکفر نہیں ہوا تھا، وہاں وہ واقعہ پیش آیا جو کبھی تاریخ میں پیش نہیں آیا۔[2]

بغداد ہزار خرابیوں کے باوجود عالم اسلامی کا سب سے بڑا شہر، علوم و فنون کا مرکز، ہزارہا علماء و صلحاء کا مسکن اور دارالخلافت ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی آبرو تھا، اس کی بربادی نے تمام حساس مسلمانوں کو تڑپا دیا، اور ہر طرف اس کا ماتم کیا گیا، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو بغداد میں طالب علمی کر چکے تھے، اور اس کی رونقیں دیکھے ہوئے

(باقی ص۳۱۸ کا) کے بعد خلافت عباسیہ کا خاتمہ کرے، خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ہلاکو نے اطاعت کا حکم بھیج دیا، مراسلت ہوتی رہی، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اب ہلاکو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، مغل نجوم سعد و نحس کے بہت معتقد تھے، حسام الدین نامی ایک سنی نجومی اس کے دربار میں تھا، اس نے کہا کہ حملہ بغداد کی یہ گھڑی نحس ہے، اور جب کسی بادشاہ نے خلافت پر ہاتھ ڈالا ہے، تو اسے منہ کی کھانی پڑی ہے، اور کسی نہ کسی بلا میں گرفتار ہوا ہے، اگر آپ حملہ کرتے ہیں تو بارش بند ہو جائے گی، طوفان اور زلزلے آئیں گے، اور ایک عالم ویران ہو جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بادشاہ (منکو قاآن) ہلاک ہو جائے گا، یہ سن کر ہلاکو متردد ہو گیا، ہلاکو نے طوسی کی رائے معلوم کی کہ "اگر بغداد حملہ کنیم عاقبت چہ خواہد شد؟" طوسی نے جواب میں کہا "چیزے نخواہد شد جز اینکہ بجائے خلیفہ خان خواہد بود" ہلاکو نے طوسی اور حسام الدین دونوں کو بلا کر مناظرہ کرایا، طوسی نے کہا کہ ہزاروں صحابہؓ شہید کر دیئے گئے، مگر کوئی فساد ظاہر نہیں ہوا، اگر عباسیوں کی خصوصیت کہتے ہو تو طاہر کو دیکھو جس نے مامون کے حکم سے خلیفہ وقت امین سے جنگ کی، اور اس نے قتل کر دیا، متوکل کو اس کے لڑکوں اور غلاموں نے اتفاق کر کے مار ڈالا، منتصر اور معتضد کو امراء اور غلاموں نے ختم کر دیا مگر کوئی زلزلہ اور طوفان نہیں آیا۔ [1] ۲۵ لاکھ آبادی میں یہ کچھ بعید نہیں، بعض مورخین نے مقتولین کی تعداد اس سے کم بیان کی ہے۔

[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص۱۱۳، ۱۱۵

تھے، ایک دل دوز مرثیہ کہا، جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترجمانی ہے، اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین — بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

اے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک — سر بر آور دین قیامت درمیان خلق بیں

نازنینان حرم را خون خلق نازنین — ز آستان بگذشت و ما را خون دل از آستیں

زینہار از دور گیتی و انقلاب روزگار — در خیال کس نگشتی کانچناں گردد چنیں

دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکت بیت الحرام — قیصراں روم سر بر خاک و خاقاں بر زمین

خون فرزندان عم مصطفیٰ شد ریختہ — ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر بر نشست — خاک نخلستان بطحا را کند با خون عجیں

روئے دریا درہم آمد زیں حدیث ہولناک — می تواں دانست بر رویش ز برج افتادہ چیں

نوحہ لائق نیست بر خاک شہیداں زانکہ ہست — کمتریں دولت مر ایشاں را بہشت بریں

لیکن از روئے مسلمانی و راہ مرحمت — مہرباں را دل بسوزد در فراق نازنین[1]

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ بھی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے، اور جمادی الاولیٰ ۶۵۸ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں، اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں، جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے:-

"عیسائی باب توما سے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کئے ہوئے تھے اور اپنا مخصوص نعرہ

۱؎ کلیات سعدی ص ۵۶

لگا رہے تھے، وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے، ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے، جن مسجد کے پاس سے گذرتے، اس کے پاس شراب چھڑکتے، کچھ شراب کی بوتلیں تھیں، جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گذرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے، مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکا دے کر کنیسۂ مریم تک پہونچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریف میں تقریر کی، اور دین اسلام، اور اہل اسلام کی مذمت کی؛"

ابن کثیر "ذیل المرأۃ" کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:-

"عیسائی جامع مسجد میں شراب لئے ہوئے داخل ہوئے ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ رہنا ہوا، تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرا دیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان قاضی، شاہد اور علماء جمع ہو کر قلعہ میں گئے، اور تاتاری حاکم قلعہ "ایل سیان" سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذلت سے نکال دیئے گئے، اور عیسائیوں کے سر برآوردہ لوگوں کی بات سنی گئی، "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"[1]

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المظفر سیف الدین قطز کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ کو عین جالوت کے مقام پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بری طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار

سیوطی "تاریخ الخلفاء" میں لکھتے ہیں:-

۱؎ البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۲۰، ۲۱۹

"تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی، اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سراسیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو پکڑ لیتے تھے، اور لوٹتے تھے"[1]

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر بیبرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی، اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ "تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں"!

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

قریب تھا کہ سارا عالمِ اسلام اس سیلاب بلا میں بہ جائے، اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور دردمند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی، اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔

تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا ہے، تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بزورِ شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خونخوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمّہ یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۹۱ (مطبعۃ المیمنیہ بمصر)

بربرنیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

پروفیسر ٹی، ڈبلیو آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بدھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جد و جہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں"[1]

"اسلام کے لئے ایسے وقت میں بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مغلوں کے طوفان ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا تو قتل کئے گئے، یا ان کو غلام بنایا گیا[2]، خانانِ مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر مہربان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق

[1] دعوتِ اسلام (مترجمہ مولوی عنایت اللہ) ص ۲۴۱،۲۴۰ [2] مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دُم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے (ہوورتھ پہلی جلد ص ۱۵۹)۔

ذبح کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو قوبلائی خان نے اپنے زمانہ میں از سرِ نو جاری کیا، اور اس کی پیروی کے لئے مخبر اور مخبروں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہونچائے، مغلوں نے اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا،[1] گیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۴۶ء تا ۱۲۴۸ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں،[2] ارغون خان نے بھی جو چوتھا ایلخان (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) ہوا مسلمانوں پر ظلم کئے، اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر اسامیاں ان کے پاس تھیں، وہ خالی کرالیں، اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا؛[3]

باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں، انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا؛[4]

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں، اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے، جن مخلصین نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے، مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔

چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہوگئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہوگئی،

---

[1] ہوورتھ ج ا ص ۱۱۲، ۱۰۳، ۲۷۴ (جس وقت یہ دیکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہوگیا اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا) [2] ہوورتھ ج ا ص ۱۶۵ [3] دی گوین ج ۳ ص ۲۶۵ [4] دعوتِ اسلام ص ۲۴۵، ۲۴۶

پروفیسر آرنلڈ نے "دعوتِ اسلام" میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جوجی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیرادادر پر حکمراں تھی، اشاعتِ اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برکہ خاں تھا جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۷ء تک سیرادادر کا خان رہا،[1] اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برکہ خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیرادادر کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لایا، اس کا حال برکہ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول.... کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برکہ خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا،[2] اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خاں نے سلطان مصر رکن الدین بیبرس سے مصالحت کر لی، اس مصالحت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیرادادر کے دو سو مغلوں کی نہایت خاطر مدارات کی، ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیرادادر اور ہلاکو خاں فاتح بغداد میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو سو مغل جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے، اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہونچائے گئے، جہاں دربارِ مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی،[3] سلطان رکن الدین نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے، اور برکہ خاں کو ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیرادادر سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برکہ خاں کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موذن مقرر ہے، اور بچوں کو مکتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے،[4] سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

---

[1] ۱۲۶۰ء میں نجم الدین مختار الزاہدی نے برکہ خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو برہان ثابت کیا، اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی مناظروں کا حال لکھا۔ [2] ابو الغازی توم ۲ ص ۱۸۱، ۱۸۷ [3] مقریزی ۲۱ توم ص ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۷ [4] ایضاً ص ۲۱۵

روانہ ہوئے تھے تو راستہ میں برکہ خاں کے سفیر ملے[1]، جو سلطان مصر کی خدمت میں اطلاع کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ برکہ خاں اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی ہے، غرض جب سلطان رکن الدین اور برکہ خاں میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو بیرادادر اکے بہت مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی[2]۔

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت ایلخانیہ میں اشاعتِ اسلام کے

متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"ایران میں جہاں ہلاکو خاں دولت ایلخانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکو خاں کا بیٹا تکودار[3] جو اپنے بھائی اباقا خاں کا جانشین ہوا، دولت ایلخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کیا، ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے[4] کہ تکودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلہ سے بھیجی۔

"خدا کی قوت اور قاآن کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تمہید کے واضح ہو کہ خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغاز نوجوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد بننے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے اس کے دل کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لئے

---

[1] مقریزی ص۱۸۸ [2] ایضاً ص۲۲۲ [3] وصاف نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے تکودار اور مسلمان ہونے کے بعد احمد لکھا ہے۔ [4] ہیتوم (راموسیو توم ۲ صنہ ٦٠)

کھول دیتا ہے، ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہب اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے پر مائل رہے، یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی اور خدا نے اپنی مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قربلتائی (کورلتائی) مبارک میں جس سے وہ مجلس مراد ہے، جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں، سب نے مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جاوے، اور ہماری فوجوں میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور ہیبت سے سب کے دل کانپتے اور تھراتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے، اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو جس کے سامنے بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگ خارا کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا جس پر ان کے ارادے پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاف تھا جس کے جاری کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعار اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا چلے، اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاویں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدا نے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو فرو کریں، اور جن لوگوں نے یہ رائے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب سے پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے بڑھانہ بننے کی خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے، اس لئے ہم پیکانوں کو جنبش میں لانے، اور کمانوں پر چلّے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اس امر کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوۃ العارفین کی نصیحت سے جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں، ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و بہبودی کی خواہش پر مبنی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا، جو ماننے والوں کے لئے خدا کی رحمت اور نہ ماننے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فرمان کے ماننے والوں کے لئے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی اور اتابک بہاء الدین کو جو اس سلطنت کے عمائد ہیں، روانہ کیا ہے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقہ سے واقف کریں، اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو بات ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے، اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں، اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں، جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں، جس سے کامیابی کی امید کر سکیں، تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے، اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدی کے قوانین کو بلحاظ ان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے، اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا الٰہی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اوقاف کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور مدرسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خانوں اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے، اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقف کرنے والوں کے شرائط کے موافق حقداروں تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو مہتم بالشان سمجھیں، اور ان کے لئے سامانِ سفر مہیا کریں، اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں کو بآرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمد و رفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقہ سے جس طرح چاہیں، سفر کریں، اور فوج اور قراغول اور شحنوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمد و رفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، فتنے اور فساد فرو ہوں نیز تلواریں میان میں رہیں، اور تمام باشندے آرام و آسائش سے بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں[1]۔"

"تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صد ہا ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مغل اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی، اور تعجب ہوا ہوگا کہ ایک مغل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے[2]۔"

"۱۲۸۴ء میں تکودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی، جس کا سرغنہ ارغون خاں تھا، تکودار کو اس نے قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء-۱۲۹۱ء) جو چند سال تک جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ برطرف کر دیئے گئے[3]، ۱۲۹۵ء تک تکودار کے جانشین اپنے قدیم مذہب شامان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان ایلخانیہ کا سب سے زیادہ بارعب اور پُر سطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی، اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولتِ مغلیہ کو عروج ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے[4]، سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا[5]، غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانۂ بادشاہی میں وہ اسلام کا بہت پابند رہا[6]۔"

---

[1] وصاف ص ۲۳۱، ۲۳۴ [2] دعوتِ اسلام ص ۲۴۸، ۲۵۱ [3] دے گبن ج ۳ ص ۲۶۳، ۲۶۵ [4] دہوسن توم ۴ ص ۱۴۸

[5] ایضاً ص ۳۶۵ [6] دعوتِ اسلام ص ۲۵۳

مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے، اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا ایک نیک دل مسلمان ترک امیر توزون[1] کے سر ہے، جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:۔

"اس سال چنگیز خاں کا پرپوتا قازان بن ارغون بن ابغا بن تولی بن چنگیز خاں تاتاریوں کا بادشاہ ہوا، اور امیر توزون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا، اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کئے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا، اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیئے گئے، اور ان پر جزیہ مقرر کیا، بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں، اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور ہیاکل (؟) دیکھے اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا۔"[2]

"آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۴ء میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدابندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی، اور بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی، اور نکولس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا، لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خاں یعنی سلطان خدابندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا،[3] غرض اس زمانہ سے قلمرو ایلخانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آگیا۔"[4]

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی، اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خاں تھا، اشاعتِ اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:۔

"بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوتِ اسلام کے حالات

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ [2] البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۳ ص ۳۴۰

[3] ابن بطوطہ ج ۲ ص ۵۷ [4] دعوتِ اسلام ص ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے، اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نورِ اسلام کی برکت ملی، وہ براق خاں تھا جو چغتائی خاں کا پرپوتا تھا، اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۶۶ء-۱۲۷۰ء) اپنا نام رکھا،[6] لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خان کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودہویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ طرمشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۰ء تک سلطنت کی جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک دفعہ انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طرمشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیئے، اور جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷ء-۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں، اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں، جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور

---

[6] ابوالغازی توم ص ۱۵۹

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علٰحدہ لے جاکر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم ہوگیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہوگیا، لیکن اس نے کہا کہ "اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں، تو اس وقت تم میرے پاس آنا" چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کرکے پھر قلمرو چغتائیہ کی شکل ایک سلطنت قائم کردے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا، چند سال کے بعد تغلق تیمور نے باپ کا تخت حاصل کرلیا تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہونچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی، آخر کار اسے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان کہنی شروع کی، تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہوگیا، جو چغتائی ابن چنگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔[1]

بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تغلق تیمور نے اپنے شکاری کتے

[1] دعوتِ اسلام از آرنلڈ ص ۲۵۶

کی طرف اشارہ کرکے کمال حقارت سے شیخ جمال الدینؒ سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو؟ شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتا، تغلق تیمور کے دل میں یہ بات چبھ گئی، اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تغلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں، اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، بہرحال اتنا محقق ہے کہ تغلق تیمور کے اسلام لانے، اور بالواسطہ کاشغر اور سلطنت چغتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و درد نے وہ کام کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کرسکتیں "جزاہ اللہ عن الاسلام و نبیہ خیر الجزاء"

چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں اور قوبلائی خاں جیسے نامور فرمانروا گذرے ہیں، اور جو تاتاری سلطنتِ عظمٰی کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرنلڈ لکھتا ہے:-

"تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے، جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کرلیتے تھے، اوگتائی خاں (۱۲۲۹ء تا ۱۲۴۱ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا،[1] تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۲۹۵ء تا ۱۳۰۷ء) خانِ انندا نے جو قوبلائی خاں کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور تانگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے تحت میں تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہوگئے، تیمور خاں نے انندا خاں کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ انندا خاں اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا، اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد انندا خاں قید سے رہا کردیا گیا، کیونکہ تانگوت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہوچلی تھی۔"[2]

[1] و ہوسن ج ۳ ص ۱۲۱ [2] ایضاً توم ۲ ص ۵۳۲، ۵۳۳

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے، اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالمِ اسلام علمِ کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علمِ کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعرہ پھر اشاعرہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (۶۰۶ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنھوں نے علمِ کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالمِ اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شئی کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل، منطقی ترتیب، اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

متکلمین اشاعرہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعرہ کے علمِ کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انھوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور ماورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انھوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائقِ اشیا کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ تھا کہ تمام عالمِ اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل در نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جا سکی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابو الحسن اشعری یا حجۃ الاسلام غزالی سا مجتہد اور ذہین و طباع پیدا نہیں ہوا تھا، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، متکلمین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتیاب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گرہیں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، "وجدان" جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسۂ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جا سکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی، امت کی قوتِ عمل اور اس سے بڑھ کر "حرارتِ عشق" جو اس امت کا سرمایہ، اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی، اور "حرارتِ عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک "مدرسہ" میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر "زندگی" اور محبت "معرفت" اور نگاہ "نایاب تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحبِ دل متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالمِ اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقتور شخصیت کی ضرورت تھی، جو دل دردمند اور فکر ارجمند دونوں سے فیضیاب ہو، جس کے لئے عقلیات کا سمندر پایاب ہو چکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمیٔ عشق اور سوزِ دروں سے اس یخ بستہ عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور عقل کے اس "نگار خانہ" میں عشق کا صور پھونک دے، جو ایک ایسے نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفین کی زبان بندی کے بجائے دماغ کی شکن دور کر دے، اور دل کی گرہ کھولے، اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے، یہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ٦٧٢ھ) کی تھی، جن کی مثنوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی "ہوس پرستی" کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلان جنگ ہے، اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف "مرأۃ المثنوی" نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں مثنوی اور صاحبِ مثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے، ان کی کتاب "مرأۃ المثنوی" سے متعلق لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی، مرأۃ المثنوی کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور محققانہ تصانیف ہیں، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحب المثنوی (۲) نقد المثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت "ادبیاتِ رومی" میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحب المثنوی دار المصنفین میں زیر طبع ہے، راقم سطور کو ان کے صاحبزادہ توکل حسین کی عنایت سے اس بیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاہ اللہ خیرا۔

خاندان اور والد نامدار

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے آپ کا نسب باپ کی جانب سے نو واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی سے مل جاتا ہے، اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔

مولانا کے آبائے کرام بلخ واقع خراسان[1] کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلہ میں اجلہ علماء اور سلاطینِ وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکۂ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہاء الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۴۳ھ میں ہوئی حضرت بہاء الدین ولد نوعمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتاوے آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا سا تھا، سلطان العلماء خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دوشنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی، اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۴-۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کیے۔

[1] حال واقع ملک افغانستان۔ (ندوی)

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتبِ آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے از کار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کر سکتے ہیں، اس برملا مذمت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے[1] مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہیے، فاضل مذکور نے

[1] عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک "تاریخی" غلطی ہے، جو منقول چلی آرہی ہے، اس لئے کہ حضرت بہاء الدین ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۰۶ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انھوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزمان فروزانفر حجن کی محققانہ کتاب زندگانی و مولانا جلال الدین محمد ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر ۶۱۰ھ کا واقعہ ہے اور امام فخر الدین رازی ۶۰۶ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۴۔ قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہاء الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور طبقاتِ ناصری ص ۳۳۵ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ (ندوی)

یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت وکثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی، میرے پاس امورِ سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔

اس پیغام کو سن کر آپنے ارشاد فرمایا کہ "سلطانِ اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ ودفینہ، ملک ولشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع واحباب کے ساتھ یہاں باستقلال سلطنت کرے، جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا۔"

اہالی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر میں ایک تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا، خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے، اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادۂ سفر سے باز رہئے، مگر آپنے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا، مولانا نے اس کو منظور فرمایا، جمعہ کو وعظ کہا، اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکرِ تاتار آرہا ہے۔[1]

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہونچتے تھے، وہاں کے عمائد وعلماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔

بغداد ومکہ معظمہ، دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپنے چار سال قیام فرمایا، اور درس وتدریس میں مشغول رہے، آقشہر سے لارندہ تشریف لائے، جو توابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کیقباد سلطان روم کی خواہش ودرخواست پر آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ تشریف لے گئے،

---

[1] بدیع الزماں فروزانفر کا رجحان یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاتاریوں کا عزم خراسان وایران تھا، اس اطلاع سے بڑے بڑے خاندان شرفاء وعلماء ترکِ وطن کر رہے تھے، اور محفوظ مقامات کی طرف رختِ سفر باندھ رہے تھے، ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۱۵ (ندوی)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا، اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسۂ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہو گیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری وباطنی آپ سے حاصل کرتے رہے، ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے، جو آئندہ آپ کا مسکن ومدفن بننے والا تھا۔

قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدر الدین گہرتاش نے آپ کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کے لئے مدرسۂ خداوندگار تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقف کیا۔

سلطان علاء الدین کیقباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ "دفع سیل ومنع خیل کے لئے اچھا ہے، مگر مظلوموں کی تیرِ دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں، لاکھوں برجوں سے گذر جاتی، اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل وانصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے"

سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطانِ وقت اور علماء واکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے، اور آپ نے سلسلۂ درس وتدریس اور تلقین وارشاد کو بدستور جاری رکھا، سید برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہو گئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۳۷ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۰ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم واکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور حلب میں وارد ہوئے،

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک الظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلۂ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے، جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ حلاویہ میں قیام پذیر ہوئے، اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا، مولانا یہاں اگرچہ تحصیلِ علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے، اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید برہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماءِ ظاہر کے لباس میں رہے، اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن منہمک رہے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزمِ علم آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آگئے، جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشغال تھے، جو علماءِ ظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت شغل تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا شغل یا فرض وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا شغل بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے، اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلابِ حال

یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قونوی کو مشہور روزگار مولائے روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شیفتگی و فنائیت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم   تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریز کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے۔[1]

نے در و اصل و نے نسب پیداست   می نہ دانیم ہم کہ او ز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبۂ عشق و محبت کے حامل تھے، "مناقب العارفین" میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہونچے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

---

[1] بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ امید کی نسل سے تھے، ان کے والد جلال الدین حسن جب منصبِ امامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نو مسلمان کے لقب سے مشہور ہوئے، لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۵۲، ۵۳ (ندوی)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابوبکر سلّہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجاسی[1] کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، نمد سیاہ پہنتے، اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو "شمس پرندہ" کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازاربند بُن لیا کرتے، اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے اسے روشن کر آؤ، دوشنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہونچے، اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار چلے آرہے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ؎

[1] بدیع الزماں فروزانفر نے بجائے زین الدین سنجاسی کے رکن الدین سنجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سنجاس، زنجان کے توابع میں سے ہے، ص۵۶، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے، (ندوی)

علم کز تو ترا نہ بستاند | جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا اس سے متغیر و متحیر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا[1]۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے، اور بقول افلاکی چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے، جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزلت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی بما راہِ حقیقت بنمود | ما ز فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

ابھی تک مولانا استاذ دوراں تھے، اور خود صاحب سجادہ تھے، اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفید و طالب، اب مولانا مستفید و طالب تھے، اور شمس تبریز صاحبِ فیض و ارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں ؎

شیخ استاذ گشت نو آموز | درس خواندی بخدمتش ہر روز

گرچہ در علم فقر کامل بود | علم نو بود کو بوے بہ نمود

خود مولاناؒ اپنی زبان سے فرماتے ہیں ؎

زاہد بودم ترنہ گویم کردی | سر فتنۂ بزم و بادہ جویم کردی

سجادہ نشیں باوقارے بودم | بازیچۂ کو دکاں کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

[1] صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت تذکرۂ دولت شاہ کی ہے، ص۱۹۶، ۱۹۷، فروزانفر نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فریفتگی کا سبب کسی اچانک واقعہ اور تصرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردانِ خدا کی تلاش عشق و اہلِ عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ ہو زندگانی جلال الدین محمد ص۶۱ (ندوی)

ترک کردی، خود فرماتے ہیں ؎

عطار دوار دفتر پارہ بودم　　زدشت او زبانے می نشستم
چو دیدم نوح پیشانی ساقی　　شدم مست و قلم ہارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے، اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، ایک برہمی کے ساتھ گونہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف واکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے اب ایک بے نام ونسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس وتدریس وعظ سب بند ہوگئے، ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنکے کی طرح بہالے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہوگئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، اِدھر اُدھر ٹل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں وپیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوسکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزردہ ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فتنہ وفساد پر ہوگا، تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ دی ہے، اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا، اس کے بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ توجہ تھی، وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق ووفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہوگئے۔

مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط اچانک مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی اور شمس کے شوق وعشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور اشتیاق ملاقات کی بیتابی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامۂ شوق میں فرماتے ہیں ؎

ایھا النور فی الفواد تعال　　غایۃ الوجد والمراد تعال
ایھا السابق الذی سبقت　　منک مصدوقۃ الوداد تعال
چوں بیائی زہے کشاد و مراد　　چوں نیائی زہے کساد تعال
انت کالشمس اذ دنت ونأت　　یا قریبا علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہوگئی، اطمینان ہوجانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت ترک کردی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگذر فرمائیں، اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیاز نامہ بھیجا اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کردی ۔۔۔ از حلاوت جدا شدیم چو موم

ہمہ شب چو شمع مے سوزیم ۔۔۔ ز آتشش جفت وز انگبیں محروم

در فراق جمال تو ما را ۔۔۔ جسم ویران وجان ازو چوں بوم

ہاں عناں را بدیں طرف برتاب ۔۔۔ زفت کن پیل عیش را خرطوم

بے حضورت سماع نیست حلال ۔۔۔ ہمچو شیطان طرب شدہ مرجوم

یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد ۔۔۔ تا رسید آں مشرفہ مفہوم

پس بذوق سماع نامۂ تو ۔۔۔ غزل پنج وشش بشد منظوم

شام از تو چو صبح روشن باد ۔۔۔ اے بتو فخر شام وارمن وروم

سلطان ولد حضرت شمس کو عزت واحترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہونچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آ آکر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی، اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص واتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دورِ خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزردگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تا بخانہ کے قریب ہی دالان "صفہ" میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے منجھلے صاحبزادہ (چلپی علاء الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی، کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظرِ عنایت رکھتے ہیں اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آکر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے، اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف وحلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسبیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا ابھی بالکلیہ اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے تھے، اور آپ خود بھی آزردہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعۃً غائب ہو گئے[1]۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ ۔۔۔ تا رود از دل اندبان ہمہ

مولانا کی بیتابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد

---

[1] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا "یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ" لیکن فروزانفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد سب سے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے، ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس قتل کر دیئے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی ص ۸۲-۸۳) (ندوی)

کے خلوت خانہ پر جاکر آواز دی "بہاء الدین چہ خفتہ؟ برخیز وطلب شیخت کن کہ باز مشام جان را از فوائح لطف او خالی می یابیم"۔

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہوگیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون   بے سروپا ز عشق او چو ذوالنون

جو لوگ حضرت شمس کی آزردگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کردیا، لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ آپنے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ ۶۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت شمس کے غائب ہوجانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کرچکے تھے، اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا، مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آشکار و نہان شور و فریاد کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ پڑگیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہوسکا کہ رومیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترکتازی، اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہوجانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا لباس تک اتار کر اس کی نذر کردیتے شکرانہ دیتے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکونِ خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہوگئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکا دی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں، جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے، اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، بس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپنے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہوگئے تھے مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدس اللہ سرہٗ شمس الدین تبریزی و اعظم اللہ ذکرہٗ بصورت در دمشق نیافت بمعنی در خود بیافت زیرآں حال کہ شمس الدین را بود حضرتش راہماں حاصل شد"۔

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا، ۶۴۷ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و دمساز قرار دیا۔[1]

شہ صلاح الدین زبعد شمس دین	گشت او را اندریں درزش معین
حال و قالش از وجودش می فزود	سرہائے نادر از وے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، عزیز الدین کی اولاد تھے، جو ماہی گیری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب و اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہرحال صاحب علم تھے، یہ صاحب تو یہیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا ہے، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔[2]

---

[1] فروزانفر لکھتا ہے "مولانا از دیدار شمس نومید گشت بتمامی دل و بکلی ہمت روئے در صلاح آورد و او را شیخی و خلیفتی و سر لشکری جنود الله منصوب فرمود و یاران را باطاعت وے مامور ساخت" ص ۹۳ (ندوی) [2] بدیع الزماں فروزانفر "زندگانی مولانا جلال الدین محمد" میں لکھتا ہے "مولانا بکوری چشم منکران حسود، دیدہ بر صلاح الدین گماشت و بہان عشق و دل باختگی کہ با شمس داشت باوے بنیاد نہاد و از انجا کہ صلاح الدین مردے وارام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام تر گردید و از بے قراری بقرار باز آمد و برائے شکستن خمار ہجران شمس از پیمانہ وجود و طلب ہائے سبک می نوشید" ص ۱۰۲-۳!

دس برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے، اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے دار سرور کی طرف سفر کیا۔

چلپی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلپی[1] حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلپی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے، اور مولانا کے انتقال کے بعد ۱۱ برس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان اخی سے تعلق رکھتے تھے۔[2]

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی، اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلپی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل مملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آتے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔[3]

---

[1] چلپی ترکی زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے۔ [2] فروزانفر نے ان کی تاریخ ولادت ۶۲۲ھ لکھی ہے [3] مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوتیں سب چلپی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا کہ "واللہ باللہ تاللہ کہ اگر صد ہزار کامل زاہد احالت مخمصہ واقع شود و ہم بہلاکت باشند و مارا گیتا نان باشد آن را ہم بحضرت چلپی فرستیم" مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شگفتگی نہیں ہوتی تھی جس مجلس میں چلپی نہ ہوتے مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے، جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی وہ مجلس میں سب سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلپی موجود ہوں، تاکہ دریائے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگانی ص ۱۰۵)۔ ندوی

مثنوی کی تحریک

مثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے، اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے، بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا، "مثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"[1]

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

---

[1] فروزانفر نے لکھا ہے کہ مثنوی کی تالیف چلپی حسام الدین کی فرمائش وطلب سے ہوئی، انھوں نے لکھا ہے کہ چلپی دیکھتے تھے کہ مولانا کے احباب و متوسلین شیخ عطار و سنائی کی تصنیفات وکلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے، مگر اس میں حقائق تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع وجوش عشق ہے، وہ موقع کے منتظر تھے، ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقہ سنائی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے، مولانا نے سنتے ہی اپنے عمامہ سے ایک کاغذ نکالا، جس میں ۱۸ شعر لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا جس کو مثنوی کا آغاز اور مطلع بننا نصیب ہوا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند   وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔ ع

پس سخن کوتاہ باید والسلام

پس یہ مثنوی کی تالیف کا آغاز تھا، مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے، اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھ لینے کے بعد حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی شغل میں گزر جاتی، اور مثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی، مثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا، اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا، اور وہ مضمحل ہو گئے، ان کے اضمحلال سے مولانا کی طبیعت بھی رک گئی، اور دو سال تک مثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا سلسلہ شروع ہوا، اور مولانا کی وفات تک جاری رہا، یہ مدت ۱۵ سال کی تھی (زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۱۱۸-۱۱۶)۔ ندوی

بعد حسام الدین آپ کے ہمراز و دمساز رہے، بلکہ سلسلۂ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید برہان الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے، سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، "دیوان و مثنوی" انہی حضرات کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہوا کرتی ہے، خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا، حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ "یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا" محبان متقی کی صفت یہ ہوگی "اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ"

خود فرماتے ہیں:۔

موجبِ ایماں نہ باشد معجزات   لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاکی کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحبِ فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آ گئے، مولانا سے طلب امداد کی، فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے، لقمہ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی، اور یہ زحمت تم لوگوں سے

رفع ہوجائے گی اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی :۔

با ایں ہمہ مہر و مہربانی ‏ ‏ ‏ دل می دہدت کہ خشم رانی

دیں جملہ شیشہ ہائے جان را ‏ ‏ ‏ درہم شکنی بہ لن ترانی

چلپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عیادت کو آئے، مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفائے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحتِ کلی حاصل ہوجائے گی، مولانا نے فرمایا، اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور، نور میں شامل ہوجائے۔

مرض ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلپی لکھتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے۔

رو سر بنہ بہ بالیں تنہا مرا رہا کن ‏ ‏ ‏ ترکِ من خرابے شب گرد مبتلا کن

ماییم و موجِ سودا شب تا بروز تنہا ‏ ‏ ‏ خواہی بیا ببخشا خواہی برو جفا کن

از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی ‏ ‏ ‏ بگزیں رہِ سلامت ترک رہ بلا کن

ماییم و آبِ دیدہ در کنج غم خزیدہ ‏ ‏ ‏ بر آب دیدۂ ما صد جائے آسیا کن

خیرہ کشی است ما را دارد دلے چو خارا ‏ ‏ ‏ بکشد کشش نہ گوید تدبیر خوں بہا کن

بر شاہ خوبرویان واجب وفا بنا شد ‏ ‏ ‏ اے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن

دردیست غیر مردن کانرا دوا بنا شد ‏ ‏ ‏ پس من چگونہ گویم کاں درد را دوا کن

در خواب دوش پیری در کوئے عشق دیدم ‏ ‏ ‏ بادست اشارتم کرد کہ عزم سوئے ما کن

عین انتقال کے قریب فرمایا :۔

گر مومنی و شیریں ہم مومنست مرگت ‏ ‏ ‏ در کافری و تلخی ہم کافرست مُردن

۵ رجمادی الاخریٰ ۶۷۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال

فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے، اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی توریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا جب یہ خبر پروانہ[1] کو پہونچی، تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمھیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انھوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہونچا، آخر بوقتِ شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدۂ ظاہر سے نہاں ہوگیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں :۔

"مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے، آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان رکھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء، اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا، سلاطین و امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاء و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ورنہ زیادہ تر محبت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے۔"

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

[1] معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سوجاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد | کسے کز خار دارد او نہالین

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد | ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد

خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید | خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزہ اکثر رکھتے تھے، اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے، اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی، اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:۔

چو نمازِ شام ہر کس نہد چراغ و خوانے | منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے

چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم | در مسجدم بسوزد چو در رسد اذانے

عجبا نماز مستان تو بگو درست ہست آں | کہ نداند او زمانے نہ شناند او مکانے

عجباً دو رکعت ست ایں عجبا چہارم ست ایں | عجبا چہ سورہ خواندم، چو نداشتم زبانے

در حق چگونہ کوبم؟ کہ نہ دست ماند و نے دل | دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم | کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے، لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی، اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے، اسی لحاظ سے کرتا عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سرِ راہ سو رہا تھا، جس سے راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، اُدھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو ہٹا دیا، مولانا نہایت آزردہ ہوئے، اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سرِ راہ لڑ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے، اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے، اس لئے اس کے معاوضہ میں فتوی لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتوی لائے تو گو میں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کردو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے، اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں، اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہلِ دنیا سے یکسوئی

مولانا کو بالطبع امراء و سلاطین سے نفرت تھی، صرف حسنِ خلق کی وجہ سے ان سے مل لیتے تھے، ورنہ ان کی صحبتوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمایئے گا، فرمایا۔

"معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں[1]"

مثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

مثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پُرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

[1] سوانح مولانا روم باختصار و خفیف تغیر۔

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشین صحبت نے ان کی فطرت کو چھیڑ دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پردے ڈال دیئے تھے، وہ دفعتًہ اٹھ گئے، اور وہ سراپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید | از رگ اندیشہ ام آتش چکید[1]

اس مقام پر پہونچ کر عارف کے ہر بُن مو سے صدا آتی ہے کہ۔

درجہان یارب ندیم من کجاست | نخل سینایم کلیم من کجاست[2]

یہی وجہ تھی کہ ہمدم و ہمراز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلپی نہیں مل گئے، ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع

شمع را تنہا طپیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع | کہ ازو باشد خیالِ اجتماع
قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر | بلکہ صورت گردد از بانگِ صفیر[3]
آتشِ عشق از نواہا گرد تیز | آنچنانکہ آتشِ آں جوز ریز[4]

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیڑا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول۔

جوشِ نطق از دل نشان دوستیست | بستگی نطق، از بے الفتی است
دل کہ دلبر دید کے ماند ترش | بلبلِ گل دیدہ کے ماند خمش[5]

[1] اقبال در مثنوی اسرار خودی [2] ایضاً [3] مثنوی ص ۳۱۹۔ نول کشور اشاعت نہم [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۵۵۱

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام مثنوی ہے، یہ ان کے خیالات و حالات، واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے، اس میں صاحبِ کلام کا سوز و درد، جوش و مستی، اور ایمان و یقین بھرا ہوا ہے، اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع

ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو[1]

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشو و نما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقولی عالم تھے، توفیقِ الٰہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہونچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و مغز تک پہونچے تو ان کو فلسفہ و علمِ کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و متکلمین اور اہلِ استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علمِ کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور حواسِ ظاہری پر تھا، ان حواسِ خمسہ کو علم اور حصولِ یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابلِ وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے، اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس "حسیت" کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس حواس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

---

[1] اقبال بالِ جبریل۔

تھی، مولانا اس حواس پرستی اور اس کے پر جوش وکیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

چشمِ حس را ہست مذہب اعتزال | دیدۂ عقل است سنی در وصال
سخرۂ حس اند اہلِ اعتزال | خویش را سنی نمایند از ضلال
ہر کہ در حس ماند او معتزلی است | گرچہ گوید سنیم از خامی است
ہر کہ بیروں شد ز حس سنی وے است | اہلِ بینش اہلِ عقلِ خویش بیست[1]

انھوں نے جابجا ثابت کیا ہے کہ ان حواسِ ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ حواسِ باطنی عطا ہوئے ہیں، یہ حواسِ باطنی حواسِ ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور وقیع ہیں، فرماتے ہیں:۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس | آں چو زر سرخ و ایں حسہا چو مس
اندراں بازار کاہل محشر اند | حسِ مس را چوں حسِ زر کے خرند
حسِ ابداں قوتِ ظلمت می خورد | حسِ جان از آفتابے می چرد[2]

ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا حواس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہاں اور دوا میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرینِ باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

حجتِ منکر ہمی آید کہ من | غیر ازیں ظاہر نمی بینم وطن
ہیچ نندیشد کہ ہر جا ظاہر است | آں ز حکمت ہائے پنہاں مخبر ست
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیست | ہمچو نفع اندر دواہا مضمر است[3]

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائقِ باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:۔

---

[1] مثنوی ص ۱۰۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۶۸

چونکہ ظاہر ہا گرفتند احمقاں | آں دقائق شد ازیشاں بس نہاں
لاجرم محجوب گشتند از غرض | کہ دقیقہ فوت شد در مفترض[1]

حواس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالمِ غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے، اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں، اور وہ اس عالم کا کوئی تجربہ نہیں رکھتی، دریائے شور کا رہنے والا آبِ شیریں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟

اے کہ اندر چشمۂ شور است جات | تو چہ دانی شطّ و جیحون و فرات[2]

وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقلِ جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ، عالمِ ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لئے باعثِ بدنامی اور انسان کے لئے سببِ ناکامی ہے، اس عقلِ جزوی سے دیوانگی اچھی!

عقلِ جزوی آفتش وہم ست وظن | زانکہ در ظلمات شد اورا وطن[3]
عقلِ جزوی عقل را بدنام کرد | کامِ دنیا مرد را بے کام کرد[4]
زیں خرد جاہل ہمی باید شدن | دست در دیوانگی باید زدن[5]

وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقلِ دوراندیش کا تجربہ کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہونچا ہوں۔

آزمودم عقلِ دور اندیش را | بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را[6]

پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے کافی ہوتی تو اہلِ منطق و استدلال اور ائمۂ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرمِ اسرار ہوتے۔

اندریں بحث از خرد رہ بیں بُدے | فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے[7]

ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پرداختہ علوم، علمِ حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور ان سے گلوخلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:۔

گر تو خواہی کت شقاوت کم شود | جہد کن تا از تو حکمت کم شود
حکمتے کز طبع آید و ز خیال | حکمتے بے فیض نورِ ذوالجلال
حکمتے دنیا فزاید ظن و شک | حکمتِ دینی بُرد فوقِ فلک[1]

ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے، جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی یہ تمثیل ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود | پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود[2]

ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور حلاوت ایمانی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ متکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے، اور آموختہ سا سنا دیتا ہے خود بے روح، اور ذوق و کیفیاتِ یقین سے محروم ہے۔

آں مقلد صد دلیل و صد بیان | بر زباں آرد ندارد ہیچ جان
چونکہ گوینده ندارد جان و فر | گفت اورا کے بود برگ و ثمر[3]

وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود ہے، اس عقل ایمانی کے قائل ہیں، جو خود عقل کے لئے رہنما اور اس کے لئے چراغِ راہ ہے، اور حواس سے وہ نسبت رکھتی ہے، جو عقل جزوی جسم کے ساتھ، اور حس کے بغیر یہ عقل عقل کہلانے کی مستحق نہیں اس لئے اس کو عقلِ عقل

کہہ سکتے ہیں یہ عقلِ عقل ان لوگوں کا حصہ ہے جو نورِ ایمان اور دولتِ یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی   شہسوارِ عقلِ عقل آمد صفی[1]

عقلِ جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقلِ عقل سے عالم مطلعِ انوار ہے۔

عقل دفترہا کند یکسر سیاہ   عقلِ عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی وسپیدی فارغ است   نورِ ماہش بر دل وجاں بازغ است[2]

عقلِ ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے، عقلِ جزوی کا تقاضا خوف وہراس اور دنیا کے اندیشے ہیں، عقلِ ایمانی کا تقاضا اطمینان وسکون اور خواہشاتِ نفس سے حفاظت ہے۔

عقلِ ایمانی چو شحنہ عادل است   پاسبان وحاکمِ شہرِ دل است

عقل درتن حاکمِ ایمان بود   کہ زبیمش نفس در زندان بود[3]

ان کے نزدیک جس طرح حواس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے، اور چٹکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیرِ عقل باشد اے فلاں   عقل اسیرِ روح باشد ہم بدان

دست بستہ عقل راجان باز کرد   کارہائے بستہ راہم ساز کرد[4]

فلسفی ادنیٰ معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید زمعقولاتِ دون   عقل از دہلیز می ناید برون[5]

فلسفی خود اپنی عقل وفکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بدقسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف اور رُخ صحرا کی طرف ہے اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھتا ہے منزلِ مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

[1] مثنوی ص۲۴۶ [2] ایضاً ص۲۴۶ [3] ایضاً ص۳۴۷ [4] ایضاً ص۲۳ [5] ایضاً ص۸۲

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت   گو بدو کو راسوئے گنج است پشت

گو بدو چنداں کہ افزوں می دود   از مرادِ دل جداتر می شود[1]

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صدہا چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے ناآشنا ہے، حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم   جانِ خود را می نداند ایں ظلوم

داند او خاصیتِ ہر جوہرے   در بیانِ جوہرِ خود چوں خرے

قیمتِ ہر کالہ می دانی کہ چیست   قیمتِ خود را ندانی زاحمقیست

جانِ جملہ علمہا ایں ست ایں   کہ بدانی من کیم در یومِ دیں[2]

وہ اپنے زمانہ کے عالم ومتکلم کو حکمتِ یونانی سے حکمتِ ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں، جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمتِ یونانیان   حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں[3]

وہ کہتے ہیں کہ تزکیۂ نفس سے صحیح معرفتِ نفس حاصل ہوگی، لوحِ دل جتنی صاف ہوگی، حکمتِ ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے اس وقت بغیر کتاب واستاد کے انبیاء علیہم السلام کے علوم ومعارف وارد ہوں گے، اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن از اوصافِ خود   تا بہ بینی ذاتِ پاکِ صافِ خود

بینی اندر دل علومِ انبیاء   بے کتاب وبے معید واوستا[4]

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چوں شود صافی وپاک   نقشہا بینی بروں از آب وخاک

[1] مثنوی ص۵۴۴ [2] ایضاً ص۴۴۹ [3] ایضاً ص۸۶ [4] ایضاً۔

روزنِ دل گرکشادست وصفا — می رسد بے واسطہ نورِ خدا

دعوتِ عشق

ساتویں صدی میں علم کلام اور عقلیت کی جو سرد ہوا عالمِ اسلام میں مشرق سے مغرب تک چلی تھی، اس سے دل کی انگیٹھیاں سرد ہو گئی تھیں، اگر کہیں عشق کی چنگاریاں تھیں تو راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں، ورنہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک افسردہ دلی بلکہ مردہ دلی چھائی ہوئی تھی، اور کہنے والا دیر سے کہہ رہا تھا کہ۔

کبھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

اس سرد اور خواب آور فضا میں مولانا نے "عشق" کی صدا بلند کی، اور اس زور سے بلند کی کہ ایک بار عالمِ اسلام کے جسم میں بجلی سی کوند گئی۔

مولانا نے کھل کر عشق کی دعوت دی اور محبت کی کرامت اور عشق کی کرشمہ سازیاں بیان کیں۔

از محبت تلخہا شیریں شود — وز محبت مسہا زریں شود

از محبت دردہا صافی شود — وز محبت دردہا شافی شود

از محبت سجن گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت سنگِ روغن می شود — بے محبت موم آہن می شود

از محبت سقم صحت می شود — وز محبت قہر رحمت می شود

از محبت مردہ زندہ می شود — وز محبت شاہ بندہ می شود[1]

وہ عشق کی طاقت و نعمت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

۱ مثنوی صہ ۱۳۴

جسمِ خاک از عشق برافلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

عشق جانِ طور آمد عاشقا — طور مست و خرَّ موسیٰ صعقا[1]

وہ فرماتے ہیں، عشق نہایت غیور و خوددار ہے، وہ ہفت اقلیم کی سلطنت کو خاطر میں نہیں لاتا، جس نے ایک بار اس کا مزہ چکھ لیا، اس نے پھر کسی کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی[2]

وہ دو عالم سے بیگانہ اور دنیا کا سب سے بڑا مست و دیوانہ ہے۔

با دو عالم عشق را بیگانگی — اندرو ہفتاد و دو دیوانگی[3]

وہ شاہوں کا شاہ اور مطلوبوں کا مطلوب ہے، بادشاہوں کے تخت و تاج اس کے قدموں کے نیچے ہیں۔

سخت پنہاں است و پیدا حیرتش — جان سلطانانِ جاں در حسرتش

غیر ہفتاد و دو ملت کیشِ او — تخت شاہاں تختہ بندے پیش او[4]

اس فقرِ جسور اور عشقِ غیور کا جب وہ تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو خود ان پر جوش و سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بیخود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

ملکِ دنیا تن پرستاں را حلال — ما غلامِ ملکِ عشقِ بے زوال[5]

وہ کہتے ہیں کہ عشق کی ہی وہ بیماری ہے جس سے بیمار کبھی شفا نہیں چاہتا، بلکہ اس میں اضافہ و ترقی ہی کی دعا کرتا ہے۔

جملہ رنجوراں شفا جویند و این — رنج افزون جوید و دردو چنین

خوشتر زین سم ندیدم شربتے — زین مرض خوشتر نباشد صحتے[6]

لیکن وہ ایسی بیماری ہے کہ پھر کوئی بیماری نہیں ہوتی۔

۱ مثنوی صہ ۵ ۲ اقبال (بالِ جبریل) ۳ ایضاً صہ ۲۴۷ ۴ ایضاً صہ ۲۴۷ ۵ ایضاً صہ ۵۹۱ ۶ ایضاً صہ ۵۹۵

آں کلامت می رہاند از کلام وان سقامت می جہاند از سقام[۱]

بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں راحتیں اس پر نثار۔

پس مقامِ عشق جانِ صحت است رنجہا لیش حسرتِ ہر راحت است[۲]

یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ سالہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے سالہا نسبت بدین دم ساعتے[۳]

راہ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہیدِ عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔

خونِ شہیدان را ز آب اولیٰ تر است این خطا از صد صواب اولیٰ تر است[۴]

عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جا سکتے، جو گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خراج کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزیدنیست بردہ ویران را خراج و عشر نیست[۵]

عشق آدمؑ کی میراث اور زیرکی و چالاکی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آں کو نیک بخت و محرم است زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است[۶]

زیرکی و چالاکی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے، عشق میں کسی کے دامن سے وابستگی ہوتی ہے، اور سپردگی، زیرکی و چالاکی، اشناوری، (پیراکی) کا فن ہے، "عشق"، کشتی نوح، زیرک و چالاک کو اس طوفان میں بچتے اور ساحل تک پہنچتے اور صاحبِ عشق کو غرق ہوتے کب دیکھا گیا ہے؟

زیرکی سباحی آمد در بحار کم رہد، غرق است او پایان کار

۱؎ مثنوی ص۵۹۵ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص۱۳۹ ۵؎ ایضاً ۶؎ ایضاً ص۳۳۴

عشق چوں کشتی شود بہر خواص کم بود آفت، بود اغلب خلاص[۱]

عقل کی ہوشمندی عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس ہے، اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیرکی بفروش و حیرانی بخر زیرکی ظنیست، حیرانی نظر[۲]

مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں، لیکن عاشق بننا ممکن ہے، اگر خدا نے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی، یعقوب باش ہمچو او با گریہ و آشوب باش

تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش چوں نئی لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش[۳]

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے، اور ترقی ہے، وہ محبوب بننے میں کہاں؟ اگر محبوبانِ عالم کو اس دولتِ سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبیوں کی صف سے نکل کر "عشاق" کی صف میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی اے گمان بردہ کہ خوب و فائقی[۴]

لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے، اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہیے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار عشق را بر حیٔ جان افزائے دار[۵]

اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشقِ جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در بصر ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر

۱؎ مثنوی ص۳۳۴ ۲؎ ایضاً ۳؎ ایضاً ص۴۹ ۴؎ ایضاً ص۴۶۶ ۵؎ ایضاً ص۴۶۸

عشق آں زندہ گزیں کو باقیست　　وز شراب جانفزایت ساقیست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء　　یافتند از عشق او کار دکیا [۱]

حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حسن ازل سدا سے عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو نگو مارا بداں شہ بار نیست　　با کریماں کارہا دشوار نیست [۲]

یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے، جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا ہے لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کرے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیاتِ ابدی ہے۔

عاشقی پیداست از زاریٔ دل　　نیست بیماری چوں بیماریٔ دل
علت عاشق ز علتہا جداست　　عشق اُصطرلاب اسرارِ خداست [۳]

یہ بیماری سب بیماریوں کی دوا اور ہر قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے، جن روحانی امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مریض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض کہنہ سے شفا پاتا ہے تو سرور و بیخودی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　اے تو افلاطون و جالینوسِ ما [۴]

عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کا روادار نہیں، وہ بڑا موحد، بڑا غیور ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

۱؎ مثنوی ص۱۰　۲؎ ایضاً ص۱۰　۳؎ ایضاً ص۷　۴؎ ایضاً ص۵

تیغ لا در قتلِ غیرِ حق براند　　در نگر زاں پس کہ بعد از لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت　　شاد باش اے عشق شرکت سوز رفت [۱]

یہ عشق الٰہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اُس حسن ازلی کا قصہ ہے، جس کا نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرحِ عشق ار من بگویم بر دوام　　صد قیامت بگزرد واں ناتمام
زانکہ تاریخِ قیامت را حد است　　حد کجا آنجا کہ وصفِ ایزد است [۲]

جہانِ دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی، اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں، جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دل اے مرداں　　حصن محکم موضعِ امن و اماں
گلشن خرم بکام دوستاں　　چشمہا و گلستاں در گلستاں [۳]

۱؎ مثنوی ص۲۰۵　۲؎ ایضاً ص۴۴۲　۳؎ ایضاً ص۱۹۹

انھوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان، لیکن نخلِ دل سدا جوان اور باغِ دل بہار بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجڑ جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کز نقل روید یکدم است ۔۔۔ گلشنے کز عقل روید خرم است

گلشنے کز تن دمد گردد تباہ ۔۔۔ گلشنے کز دل دمد وافرحتاہ[1]

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی لاحاصل اور سکندر کی طرح "چشمۂ حیوان" کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آبِ حیات کا ایک جرعہ نوشِ جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاطِ روح حاصل ہو اور ہر دورِ زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تا دائما باشی جوان ۔۔۔ از تجلی چہرہ ات چوں ارغوان

طالبِ دل شو کہ تا باشی چو ل ۔۔۔ تا شوی شادان و خنداں ہمچو گل[2]

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، دل وہ نہیں ہے، جو سینہ میں دھڑکتا ہے، اور خواہشاتِ نفس اور بوالہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے ناآشنا یقین کی دولت سے محروم، ذوق و شوق سے خالی ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں، اور جس کی قسمت کبھی چمکتی نہیں، یہ دل دل نہیں، پتھر کی ایک سِل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان یہود ۔۔۔ بینوا از ذوقِ سلطانِ ودود

نے دراں دل تابِ نورِ آفتاب ۔۔۔ نے کشادِ عرصہ نے فتحِ باب[3]

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے، جیسے اہلِ دل کا بیدار و بیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھیے تو سوائے لفظی اشتراک اور جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمۂ صافی میں رواں ہے، اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل

[1] مثنوی ص ۵۹۶ [2] ایضاً ص ۱۵۴ [3] ایضاً ص ۱۷

یا کیچڑ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے، جس سے پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جز ہے کہ اس سے پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل، اور دل میں ہے، ایک دل مادہ پرست اور بوالہوس، ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے، ایک دل انبیاء و اولیاء کا ہے، جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت کے آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے، اس لئے سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے۔

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست ۔۔۔ دل فراز عرش باشد نہ بہ پست

در گلِ تیرہ یقین ہم آب ہست ۔۔۔ لیک ازاں آبت نباید آبدست

زانکہ گر آب است مغلوب گل است ۔۔۔ پس دلِ خود را مگو کاین ہم دل است

آں دلے کز آسمانہا برتر است ۔۔۔ آں دلِ ابدال یا پیغمبر است[1]

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے، اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالۂ کہ ہیچ خلقش ننگرید ۔۔۔ از خلافت آں کریم آں را خرید

ہیچ قلبے پیشِ اُو مردود نیست ۔۔۔ زانکہ قصدش از خریدن سود نیست[2]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفسِ زریں کو چھوڑ کر دل کی آزاد بستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب یہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلو کہ تم کو اس بارگاہِ عالی سے سلام پہونچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام ۔۔۔ تا کہ بے پردہ ز حق آید سلام[3]

مقامِ انسانیت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیہم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں عام انسانوں میں

[1] مثنوی ص ۲۳۹ [2] ایضاً ص ۵۲۱ [3] ایضاً ص ۴۵۰

زندگی سے بیزاری، اپنے مستقبل سے مایوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا عجمی تصوف نے فنائیت، انکار ذات اور خودشکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت سے کی تھی کہ خودنگری اور خودشناسی جس پر حرکت، جد و جہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول، اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں، بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا "اَحْسَنِ تَقْوِیْم" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے، اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

"احسن التقویم" در "وَالتِّین" بخواں — کہ گرامی گوہر است اے دوست جاں

"احسن التقویم" از فکرت بروں — "احسن التقویم" از عرشش فزوں [1]

[1] مثنوی ص ۵۱۵

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر "کرامت" کا تاج رکھا گیا ہے، اور "کَرَّمْنَا" اور "اَعْطَیْنٰکَ" کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ہیچ کَرَّمْنَا شنید ایں آسمان — کہ شنید ایں آدمی پُر غمان [1]

تاجِ کَرَّمْنَا ست بر فرقِ سرت — طوقِ اَعْطَیْنَاکَ آویز برت [2]

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصۂ کائنات اور مجموعۂ اوصافِ عالم ہے، انسان کیا ہے، ایک کوزہ میں دریا بند ہے، اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابے در یکے ذرہ نہان — ناگہاں آں ذرہ بکشاید دہان

ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین — پیش آں خورشید چوں جست از کمین [3]

بحر علمے در نمی پنہاں شدہ — در سہ گز تن عالمے پنہاں شدہ [4]

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے، اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے، اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرابے بندہ آں قد و خد — جملہ مستان را بود بر تو حسد

ہیچ محتاج مئے گلگون نئے — ترک کن گلگونہ تو گلگونئے

جوہر است انسان و چرخ او را عرض — جملہ فرع و سایہ اند و تو غرض

علم جوئی از کتب ہائے فسوس — ذوق جوشِ تو ز حلوائے سبوس

خدمتت بر جملہ ہستی مفترض — جوہرے چوں عجز دارد با عرض [5]

یہی نہیں بلکہ انسان مظہر صفاتِ الٰہی ہے، وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے۔

[1] مثنوی ص ۴۹۵ [2] ایضاً ص ۴۷۵ [3] ایضاً ص ۵۹۴ [4] ایضاً ص ۴۷۶ [5] ایضاً۔

آدم اصطرلاب اوصافِ علوست　　وصفِ آدم مظہرِ آیات اوست

ہر چہ دروے می نماید عکسِ اوست　　ہمچو عکسِ ماہ اندر آبِ جوست

خلق را چوں آب دان صاف و زلال　　وندرو تابان صفات ذوالجلال

علم شان وعدل شان ولطف شان　　چوں ستارہ چرخ در آب رواں[1]

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں، اور سچ پوچھئے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر بگویم قیمت آں ممتنع　　من بسوزم، ہم بسوزد مستمع[2]

اس رفعت وبلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہوسکتا ہے، اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل وتدبیرات وہوش　　تو چرائی خویش را ارزاں فروش[3]

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہوچکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے، اور وہی انسان کا سچا قدردان ہے

مشتریٔ ماست اللہ اشتریٰ　　از غمِ ہر مشتری ہین بر تر آ

مشتریٔ جو کہ جویانِ تو است　　عالمِ آغاز و پایانِ تو است[4]

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے، جو جوہرِ انسانیت سے آراستہ اور حقیقتِ انسانیت سے آشنا ہیں، ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں، جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مارے ہوئے اور خواہشاتِ نفس کے قتیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں، آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند　　مردۂ نان اند وکشتۂ شہوت اند[5]

۱؎ مثنوی ص۵۶۲　۲؎ ایضاً ص۵۱۵　۳؎ ایضاً ص۴۷۵　۴؎ ایضاً ص۴۳۶　۵؎ ایضاً ص۴۵۹

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی یہ حقیقی انسان کمیاب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اُکتا گئے تھے، اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت　　شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست[1]

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین، تعطل، بے علمی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیماتِ نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش خواجہ در خلوت مایست　　دینِ احمدؐ را ترہب نیک نیست

از ترہب نہی فرمود آں رسولؐ　　بدعتے چوں در گرفتی اے فضول

جمعہ شرط است وجماعت در نماز　　امرِ معروف و ز منکر احتراز

درمیانِ امت مرحوم باش　　سنتِ احمدؐ مہل محکوم باش[2]

ان کے زمانہ میں توکل تعطلِ محض کا مرادف بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط وانتظام توکل

۱؎ دیوان　۲؎ ایضاً ص۵۰۳

کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی فضیلت بیان کی "اعقلها وتوكل على الله"[1] کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

گفت پیغمبر بآواز بلند — باتوکل زانوے اشتر بہ بند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو — از توکل در کسب کاہل مشو

رُو توکل کن توباکسب اے عمو — جہد می کن، کسب می کن مو بمو

جہد کن جدّے نما تا وارہی — در تواز جہدش بمانی ابلہی[2]

انھوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کردیئے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں، یہ دلائل بڑے معقول اور وزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے، شیر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جد و جہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں، اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے اور تعطل اور ترکِ عمل منشائے الٰہی کے خلاف اور کفرانِ نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے، اور نتیجہ کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیا جائے، کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے، فرماتے ہیں:۔

---

[1] اونٹنی باندھ دو پھر اللہ پر توکل کرو [2] ص ۲۶

گفت شیر آری ولے رب العباد — نردبانے پیش پائے ما نہاد

پایہ پایہ رفت باید سوئے بام — ہست جبری بودن اینجا طمع خام

پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ — دست داری چوں کنی پنہاں تو چنگ

خواجہ چوں بیلے بدست بندہ داد — بے زبان معلوم شد او را مراد

چوں اشارتہاش را بر جان نہی — در وفائے آں اشارت جان دہی

پس اشارتہاش اسرارت دہد — بار بردارد ز تو کارت دہد

سعی شکر نعمت قدرت بود — جبر تو انکار آں نعمت بود

شکر نعمت نعمتت افزوں کند — کفر نعمت از کفت بیروں کند

ہاں مخسپ اے جبری بے اعتبار — جز بزیر آں درختِ میوہ دار

تا کہ شاخ افشاں کند ہر لحظہ باد — بر سر خفتہ بریزد نقل و زاد

گر توکل می کنی در کار کن — کسب کن پس تکیہ بر جبار کن[1]

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے، جس کی شریعت میں مذمت ہے، اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

شیر گفت آرے ولیکن ہم ببیں — جہدہائے انبیاء و مرسلیں

حق تعالےٰ جہد شاں را راست کرد — آنچہ دیدند از جفا و گرم و سرد

جہد می کن تا توانی اے کیا — در طریق انبیاء و اولیاء

چیست دنیا از خدا غافل بُدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

---

[1] دیوان ص ۲۷

مال را گر بہرِ دین باشی حمول — نعم مالٌ صالحٌ گفت آں رسولؐ

جہد حق است و دوا حق است و درد — منکر اندر نفیِ جہدش جہد کرد[۵۱]

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں، جن کے ہاتھ میں زمامِ حکومت تھی، وہ برملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچۂ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:۔

حکم چوں بر دست زنداں اوفتاد — لاجرم ذوالنون بزنداں اُوفتاد

چوں قلم در دست غدارے بود — لاجرم منصور بر دارے بود

چوں سفیہاں را بود کار و کیا — لازم آمد یَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاءَ[۵۲]

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:۔

حکم چوں در دستِ گمراہے بود — جاہ پندارید و در چاہے فتاد

احمقاں سرور شدستند و زبیم — عاقلاں سرہا کشیدہ در گلیم[۵۳]

عقائد و علمِ کلام

مولانا نے عقلیات و حسیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

[۵۱] دیوان ص ۲۸۰ [۵۲] ایضاً ص ۱۳۱ [۵۳] ایضاً ص ۳۳۵

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقدانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور معلمانہ بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی، اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی، اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور متکلمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینانِ قلب پیدا ہوتا ہے، جو علمِ کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحبِ یقین اور صاحبِ عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتبِ خیال کے ایک کہنہ مشق استاد اور متبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبتِ ربّانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روشِ عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے، اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرتِ سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجودِ باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکۃ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے اس کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لاجواب ہوکر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرتِ سلیم کو اکساتا ہے، اور اس پر اظہار اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلواتا ہے۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے، جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔
(ابراہیم - ۱۰)	

اس بیساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے، اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے مصنوعات سے صانع اور آثار سے موثر کی طرف دفعۃً رہبری ہوجاتی ہے، سارے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات سے خالق، اور مصنوعات سے صانع تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ	اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ط اَوَلَمْ یَکْفِ	اور خود ان کی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے
بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ○	ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز
(حٰم السجدہ ۵۳)	پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی مثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پنہان و قلم بین خط گزار — اسپ در جولان و ناپید اسوار

تیر پیدا بین و ناپید اکمان — جانہا پیدا و پنہاں جانِ جان[1]

لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے، اگر کہیں ہوا کی سنسناہٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہوا کا چلانے والا بھی ہے۔

باد را دیدی کہ می جنبید بدان — باد جنبا نیست اینجا باد ران

پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست — ایں کہ با جنبیدہ جنبانندہ ہست[2]

اگر تمہیں موثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں، ان آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے، جسم میں حرکت و زندگی روح سے ہے، روح اگرچہ نظر نہیں آتی، مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو اورا می نہ بینی در نظر — فہم کن آں را باظہارِ اثر

تن بجان جنبد نمی بینی تو جان — لیک از جنبیدنِ تن جان بدان[3]

موثر کے لئے اس کے آثار اور صانع کے لئے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل — جز کہ نورِ آفتابِ مستطیل[4]

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے، بلکہ منظم، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے، آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں، ابر و باد بھی پیل بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں، اُدھر کو چل دیں، ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا سرتابی کریں، فوراً گوشمالی کی جائے، یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے، اور وہ حکیم و علیم بھی ہے، اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے کسی وقت خارج نہیں۔

[1] مثنوی ص ۳۰۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

گرمی بینی تو تدبیر قدر	در عناصر، گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماہ دو گاؤ خراس	گرد می گردند و می دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند	مرکب ہر نحس و سعدے می شوند
ابر راہم تازیانہ آتشیں	می زند کہ ہاں چنیں رو نے چنیں
بر فلان وادی ببار ایں سو ببار	گوشمالش می دہد کہ گوش دار[1]

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے، اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں، بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اس میں بھی ان کا البیلاپن اور سرور و مستی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ ست	قصد من از خلق احسان بودہ ست
آفریدم تا ز من سودے کنند	تا ز شہدم دست آلودے کنند
نے برائے آن کہ من سودے کنم	در برہنہ من قبائے بر کنم[2]
من نہ کردم خلق تا سودے کنم	بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کرتے ہیں، اور بتلاتے ہیں کہ وہ طبیبانِ الٰہی اور معالجینِ قلوب ہیں، طبیب نبض سے دل تک پہونچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہونچ جاتے ہیں، طبیبوں نے صحت جسمانی کے بقاء اور انبیاء نے دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے

ما طبیبانیم شاگردانِ حق	بحر قلزم دید ما را فانفلق

[1] مثنوی ص ۵۱۳ [2] ایضاً ص ۱۵۹

آں طبیبانِ طبیعت دیگر اند	کہ بدل از نبضے بنگرند
ما بدل بیواسطہ خوش بنگریم	کز فراست ما بہ اعلیٰ منظریم
آں طبیبانِ غذا اند و ثمار	جانِ حیوانی بدیشاں استوار
آں طبیبانِ فعالیم و مقال	ملہم ما پرتوِ نور جلال
کایں چنیں فعلے ترا نافع بود	واں چناں فعلے زرہ قاطع شود
ایں چنیں قولے ترا پیش آورد	واں چناں قولے ترا نیش آورد
آں چناں و ایں چناں از نیک و بد	پیش تو بنیم و بنمائیم جد
آں طبیبانِ را بود بولے دلیل	ویں دلیل ما بود وحیِ جلیل[1]

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادا بتلاتی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلام رضؓ نے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا۔

وَاللهِ هٰذا ليس بوجه كذّاب	بخدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔
در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است	رود آواز پیمبرؑ معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے، امت کا ضمیر اس پر آمنّا و صدّقنا ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کرتا ہے اس لئے کہ وہ صدا ایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں:

[1] مثنوی ص ۲۵۰

چوں پیمبر از بروں بانگے زند　　جانِ امت در دروں سجدہ کند

زانکہ جنس بانگِ او اندر جہان　　از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جان

آن غریب از ذوق آوازِ غریب　　از زبانِ حق شنود اِنّی قریب[1]

وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں، ان کا کہنا دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی، اور نظامِ عالم اسی پر قائم ہے، پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا، طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

تشنہ را چوں بگوئی تو شتاب　　در قدح آب است بستان زود آب

ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رد　　از برم اے مدّعی! مہجور شو

یا بطفلِ شیر مادر بانگ زد　　کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد

طفل گوید مادرا حجت بیار　　تاکہ با شیرت بگیرم من قرار[2]

ان کے نزدیک معجزہ موجبِ ایمان نہیں ہے، یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان لے ہی آئے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے ملیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں، جو خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے، اور اصل ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں، اور جو مغلوب و لاجواب ہوتا ہے، وہ مشکل سے یارِ غار اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشش اور تسخیر کی چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجبِ ایمان نباشد معجزات　　بوئے جنسیت کند جذبِ صفات

ا؎ مثنوی ص۱۸۱　　۲؎ ایضاً

معجزات از بہرِ قہرِ دشمن است　　بوئے جنسیت سوے دل بردن است

قہر گردد، دشمن، امّا دوست نے　　دوست کے گردد بہ بستہ گردنے[1]

انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خود دار ہوتے ہیں، ان سے استفادہ کے لئے ادب اور نیازمندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج[2] ہیں، ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاران طالب اند و یک ملول　　از رسالت بازمی ماند رسول

ایں رسولانِ ضمیر راز گو　　مستمع خواہند، اسرافیل خو

نخوتے دارند و کبرے چون شہان　　چاکری خواہند از اہل جہان

تا ادبہا شان بجا گہ نادری　　از رسالت شان چگونہ برخوری[3]

فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں، اور کس کا پیام لائے ہیں۔

ہر ادب شان کے ہمی آید پسند　　کاندریشان زایوان بلند[4]

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زینہ ہے، آبادی ویرانی کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے، جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند　　بعد ویرانیش آبادان کند

کرد ویران خانہ بہرِ گنج وزر　　وز ہمان گنجش کند معمور تر[5]

ا؎ مثنوی ص۱۹۵　　۲؎ شاہ طبیعت　　۳؎ مثنوی ص۲۷۱　　۴؎ ایضاً　　۵؎ ایضاً ص۱۲

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہیئے کہ پھل آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند — چونکہ تن بشکست جان سر بر کند[1]

وہ جوادِ مطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا چاہیئے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگیٔ جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں "ما لا عین رأت ولا اذن سمعت، ولا خطر علی قلب بشر"

آں کسے اکش کہ چنیں شاہے کشد — سوئے تخت و بہترین جاہے کشد

نیم جان بستاند و صد جان دہد — انچہ در وہمت نیاید آن دہد[2]

ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف — آنگہے بروے نویسد او حروف

وقتِ شستن لوح را باید شناخت — کہ مر آن را دفترے خواہند ساخت

چون اساسِ خانۂ تو افگنند — اولین بنیاد را بر می کنند

گل بر آرند اول از قعر زمین — تا بآخر برکشی ماءِ معین[3]

کاغذے جوید کہ آن بنوشتہ نیست — تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے، اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، منعم

[1] مثنوی ص۲۴۷   [2] ایضاً ص۱۰   [3] ایضاً ص۱۴۱

ہمیشہ فقیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بتواں نمود — مالداران بر فقیر آرند جود

تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو، اور ٹوٹ پھوٹ کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامۂ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گِل میں مقید رہتے، اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو اور تمہارا طائرِ روح قفسِ عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازان روزے کہ در ہست آمدی — آتشے یا خاک یا بادے بُدی

گر بدان حالت ترا بودے بقا — کہ رسیدے مر ترا ایں ارتقا

از مبدّل ہستی اول نماند — ہستیٔ دیگر بجائے او فشاند[1]

ایں بقاہا از فناہا یافتی — از فنایش رو چرا برتافتی

ایں فناہا چہ زیان بودت کہ تا — بر بقا چفسیدۂ اے بے نوا[2]

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تمہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ غم نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگِ من در زندگی است — چون رہم زیں زندگی پایندگی است[3]

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے، ان کو اس جہانِ فانی سے چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مژدۂ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہودؑ اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔

ہودؑ گرد مومناں خطے کشید — نرم می شد باد کانجا می رسید

[1] مثنوی ص۴۱۰   [2] ایضاً   [3] ایضاً ص۲۷۶

ہمچنین بادِ اجل با عارفان — نرم و خوش ہمچو نسیمِ بوستان[1]

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علمِ کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے، ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے، اور عقائد و فِرق کی تاریخ میں جبریہ کے لقب سے مشہور ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا، تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے، کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر لیش گوید کہ امر و نہی راست — اختیارے نیست دین جملہ خطا است
جملہ قرآن امر و نہی است و وعید — امر کردن سنگ مرمر را کہ دید[2]

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے، کسی پر چھت کی لکڑی گرجاتی ہے، تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہالے جاتا ہے، تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے، تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں، البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحبِ اختیار ہے۔

گر ز سقفِ خانہ چوبے بشکند — بر تو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمے آیدت بر چوبِ سقف — ہیچ اندر کین او باشی تو وقف
کہ چرا بر من زد و دستم شکست — یا چرا بر من فتاد و کرد لیست
واں کہ قصد عورت تو می کند — صد ہزاراں خشم از تو سر زند

در بیاید سیل رخت تو برد — ہیچ با سیل آورد گیتی خرد
گر بیاید باد و دستارت ربود — کے ترا با باد، دل خشمے نمود
خشم در تو شد بیانِ اختیار — تا نہ گوئی جبریانہ اعتذار[1]

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ قصور نہیں، کتے کو بھی اگر پتھر مارا جائے تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتربان اونٹ کو مارتا ہے تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتربان سے انتقام لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں، تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہیئے۔

ہمچنیں گر بر سگے سنگے زنی — بر تو آرد رود گردد منثنی
گر شتربان اشترے را می زند — آں شتر قصدِ زنندہ می کند
خشم اشتر نیست با آں چوبِ او — پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار — ایں مگو اے عقل انسان شرم دار
روشن است ایں لیک از طمعِ سحور — آں خورندہ چشم بر بندد ز نور
چونکہ کلی میل آں نان خور نیست — رو بہ تاریکی کند کہ روز نیست[2]

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکماء کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور معلول کبھی علت، مسبّب کبھی سبب سے متخلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی اس رائے سے بڑی حد تک متاثر ہیں، ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شی کا

جو خاصہ اور اثر تسلیم کر لیا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرقِ عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں، اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس سے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، اور علل و معلومات، اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے، جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول، عام سنۃ اللہ یہی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں، اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرقِ عادت ممکن ہے، اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے، فرماتے ہیں:۔

بیشتر احوال بر سنت رود گاہ قدرت خارقِ سنت شود
سنت و عادت نہادہ بامزہ باز کردہ خرقِ عادت معجزہ
بے سبب گر عز بما موصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست[1]

عام لوگ انہی اسباب کو دیکھتے ہیں، اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:۔

حاصل آنکہ در سبب پیچیدۂ لیک معذوری ہمیں را دیدۂ[2]

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے، لیکن مسبب الاسباب اس سے بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ مسبب الاسباب، رب الاسباب اور قادرِ مطلق ہے، اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو کہ قادرِ مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

۱؎ مثنوی ص۲۲۷ ۲؎ ایضاً ص۲۶۱

اے گرفتارِ سبب بیروں مپر لیک عزلِ آں مسبب ظن مبر
ہر چہ خواہد آں مسبب آورد قدرتِ مطلق سببہا بر درد[1]

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں، بلکہ ان اسبابِ ظاہری سے اوپر کچھ اسباب اور ہیں، جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسبابِ باطنی ان اسبابِ ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں، جس طرح یہ اسبابِ ظاہری مسببات و نتائج کے لئے، سببِ حقیقی اسبابِ ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے، اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے، سب سے اعلیٰ اور اصل سبب ارادۂ الٰہی اور امرِ الٰہی ہے:۔

سنگ بر آہن زنی آتش جہد ہم بامرِ حق قدم بیروں نہد
سنگ و آہن خود سبب آمد و لیک تو بالاتر نگر اے مردِ نیک
کایں سبب را آں سبب آورد پیش بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش
ایں سبب را آں سبب عامل کند باز گاہے بے بر و عاطل کند[2]

ہم جس طرح ان اسبابِ ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیائے کرام ان اسبابِ حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں:۔

واں سببہا کانبیا را رہبر است آں سببہا زیں سببہا برتر است
ایں سبب را محرم آمد عقلِ ما واں سببہا راست محرم انبیا[3]

وہ اسبابِ حقیقی اسبابِ ظاہری کے حاکم اور اُن پر غالب ہیں:۔

ہست بر اسباب اسبابِ دگر در سبب منگر دراں افگن نظر[4]

یہ اسبابِ ظاہری اسبابِ حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسباب ہی سے وابستہ ہے

۱؎ مثنوی ص۲۲۷ ۲؎ ایضاً ص۲۵ ۳؎ ایضاً ۴؎ ایضاً ص۲۴۶

این سبب ہمچو مریض است و علیل — این سبب ہمچو چراغ است و فتیل

شب چراغت را فتیلے تو بتاب — پاک دان زینہا چراغِ آفتاب[1]

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسبابِ ظاہری میں الجھی ہوتی ہے، اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دماغوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے، اور عالم کا عالم شرک اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں، اور اسباب کے بجائے مسبّب اور قادرِ مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے:۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند — معجزاتِ خویش بر کیوان زدند

بے سبب بر بحر را بشگافتند — بے زراعت چاش گندم یافتند

ریگہا ہم آرد شد از سعیٔ شان — پشم ابریشم آمد کشکشان

جملہ قرآن است در قطعِ سبب — عزِ درویش و ہلاک بولہب[2]

لیکن اللہ تعالےٰ کی عمومی عادت اور سنتِ جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے، اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے:۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ — تا بداند طالبے جستن مراد[3]

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں، جن کو متکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرزِ استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیستان اور نہایت خشک اور محدود موضوعِ بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

[1] مثنوی صـ ۱۴۱ [2] ایضاً صـ ۲۴۶ [3] ایضاً صـ ۴۲۷

کے تنگ کوچہ سے نکال کر عام فہم اور عقلِ سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

مثنوی کا اثر

مثنوی نے عالمِ اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیرپا اثر ڈالا اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی، جنھوں نے عالمِ اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیائے اسلام کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے نغموں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و متکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شبہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلآویز حکایتیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہلِ سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی، اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہلِ محبت اور اہلِ معرفت نے اس کو شمعِ محفل اور ترجمانِ دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین یکسر تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا نہیں، بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہوٰی نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدتِ وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہرحال ایک

انسان کا کلام ہے، جو معصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی "تاثرات" کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالمِ اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علمِ کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروانِ فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادۂ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرمِ سفر کردیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت وحسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک وشبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات وغیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے، اور حواس ظاہری اس کی گرفت نہ کرسکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرزِ استدلال و علمِ کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو مثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی وغیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کردیا، اور فلسفہ و مادیت کے صدہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو الحاد و زندقہ کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کرچکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو مثنوی کی بدولت دوبارہ دولتِ اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحبِ ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور مفکر (ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استرشاد کا جابجا اعتراف کیا ہے، اور اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ مثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا، ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر — کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب — خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآن درمیانِ سینہ اش — جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
از نئے آں نے نوازِ پاک زاد — باز شورے در نہادِ من فتاد[1]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

رومی آں عشق و محبت را دلیل — تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل[2]

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی، اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرحِ او کردند و اوراکس ندید — معنیٔ او چوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند — چشم را از رقصِ جان بردوختند[3]

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، مثنوی کا نہیں، مثنوی اس دورِ انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتی ہے، اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبتِ پاک باز ہے:۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے — پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے[4]

یہ دولتِ بیدار مثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے، عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

۱؎ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق ص۱ ۲؎ جاوید نامہ ص۴۴ ۳؎ ایضاً ص۲۲۴ ۴؎ بال جبریل۔

فرماتے ہیں:-

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز	تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست	پائے او محکم فتد در کوئے دوست[1]

[1] جاوید نامہ ص ۲۲۴

INDEX

اشاریہ

(انڈکس: "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول)

مرتب

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

اقوام وقبائل۔ طبقات وملتیں

کتابیات

مقامات

متفرقات

مذاہب وادیان، عقائد وفلسفہ:

مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:

علوم و فنون:

زبان:

سلطنتیں و حکومتیں:

عہد و ادوار:

سکے:

تحریکات و سلاسل طرق:

اہم واقعات و معرکے:

دیگر متفرقات: